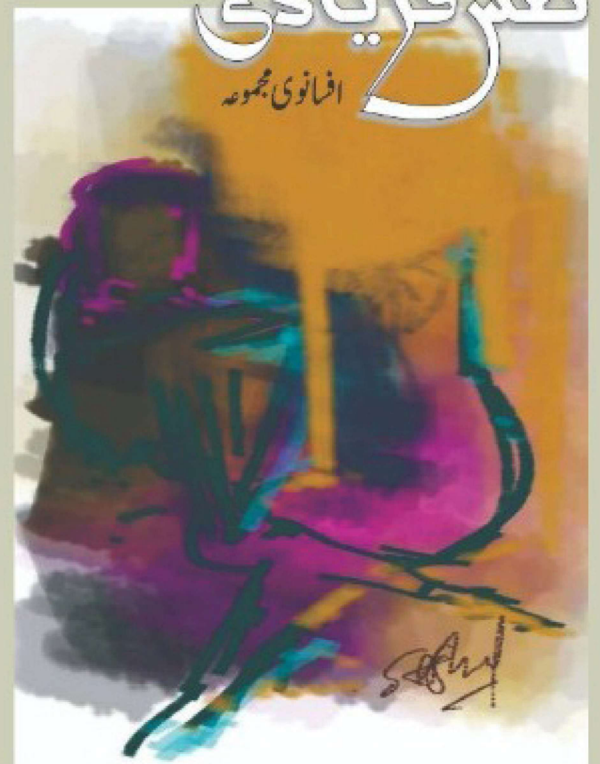
نقش فریادی

افسانوی مجموعہ



راجہ یوسف

نقش فریادی

(افسانوی مجموعہ)

راجہ یوسف

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں!
(اس کتاب میں شامل سبھی کہانیاں، کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔ جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا۔)

کتاب کا نام	:	نقش فریادی (افسانوی مجموعہ)
مصنف	:	راجہ یوسف
طبع اول	:	2021
تعداد	:	500
قیمت	:	750/-
زیر اہتمام	:	عرفان یوسف۔ عمران یوسف
ٹائٹل پینٹنگ	:	شکیل احمد شکیل
ملنے کا پتہ	:	کتاب گھر، لال چوک، سرینگر۔

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
E-mail : gnkpublications@gmail.com
Mobile : 7053562468, 7006738304

انتساب............

والدمرحوم

محمد شعبان بٹ

کے نام

جوادب سمجھانے اور سکھانے میں میرے پہلے استاد تھے۔

افسانے

فہرست

افسانچے/مائیکروفکشن

☆☆☆

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

راجہ یوسف کی افسانہ نگاری

راجہ یوسف کشمیر کے ضلع اسلام آباد (اننت ناگ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ضلع میٹھے چشموں، صحت افزا مقام ''پہلگام'' اور دریائے جہلم کا منبع ''ویری ناگ'' کی بدولت کافی مشہور ہے۔ راجہ یوسف افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ تھیٹر آرٹسٹ اور ڈراما نگار بھی ہیں۔ اردو اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔ کشمیری زبان میں ان کی ایک اہم ضخیم کتاب ''ویتھ'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آئی ہے، جس کو ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ملی۔ اس کتاب میں کشمیر کے اہم تاریخی واقعات کو تخلیقی پیرائیہ میں تمثیلی روپ دیا گیا ہے جو کہ ایک تو قاری کو کشمیر کی تاریخ سے متعلق جستہ جستہ واقفیت بہم پہنچاتا ہے اور دوسرا تمثیلی اسلوب کی دلکشی سے بھی نوازتا ہے۔ تاریخی واقعات کو تمثیلی یا ڈرامائی روپ دینا اور تخلیقی پیکر میں ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ فنکارانہ اسلوب کسی تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیت کا جواز فراہم کرنے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے اور راجہ یوسف صاحب اس کسوٹی پر کھرا اترتے نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے کتاب میں کشمیر کی تاریخ کے اہم حصوں کو بڑی فنی مہارت سے تمثیلی روپ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے موقر اردو رسائل وجرائد اور اخبارات و سوشل سائٹس کے ادبی فورمز پر شائع ہو کر قارئین کو محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ راجہ یوسف افسانوی ادب کی تخلیق کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری آغاز ۱۹۸۳ء سے ہوا ہے کیونکہ اسی برس پہلا افسانہ ''دیوار کے اس پار'' رسالہ ''قاشیں'' میں شائع ہوا تھا۔

راجہ یوسف کی کتاب ''نقشِ فریادی'' افسانوں کا وہ انتخاب ہے جو مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے آئے ہیں۔افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ یہ متنوع موضوعات پر تخلیق ہوئے ہیں' جو کہ رومانوی' سیاسی' سماجی' معاشی' معاشرتی اور عائلی موضوعات کی دلچسپ فنی عکاسی کرتے ہیں۔دراصل ادب اور سماج کے مابین ایک مشاہداتی' فکری اور تخلیقی رشتہ ہوتا ہے۔ایک ادیب سماجی مشاہدہ کو احساس کی بنیاد پر فکر کا حصہ بناتا ہے اور پھر تخلیقی پیرائیہ میں شعر و فکشن کی صورت میں قاری کے سامنے لاتا ہے۔اس میں حقائق کے ساتھ ساتھ تخیل کا تخلیقی اشتراک (Creative Collaboration) بھی شامل ہوتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ عمل کسی واقعہ یا صورتحال کی تحریری ترسیل تک ہی محدود رہے گا۔ ادب' ادیب کا اظہارِ عمل (Action of expression) ہوتا ہے۔تاہم تخلیقی ادب کا خاصہ تخلیقی تخیل (Creative Imagination) ہوتا ہے۔جس طرح کتاب کے نام ''نقشِ فریادی'' کی ترکیب سے ظاہر ہے جو کہ غالبؔ کے مشہور شعر سے مستعار ہے اور یہ شعر غالبؔ کے تخلیقی تخیل کا مثالی ثبوت فراہم کرتا ہے:

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

راجہ یوسف کے بیشتر افسانوں میں سماجی مشاہدہ کو تخلیقی پیرائیہ میں ڈھال کر کہانیوں کا روپ دیا گیا ہے' اور کہیں کہیں پر تجربے کے ساتھ تخیل کی آمیزش سے کہانی بنی گئی ہے، تاہم دونوں جگہ عمدہ فن کاری نظر آتی ہے جو کہ افسانہ نگار کی ایک اہم خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

راجہ یوسف کے بیشتر افسانوں میں مشاہدات کا تخلیقی اظہار اور اظہارِ عمل کا تخلیقی بیانیہ موجود ہے۔جن میں خصوصی طور پر ''نقشِ فریادی''،''بند کھڑکی کا کرب''،''سبیل''

''چیل' چنار اور چوزے''''نا قابل تنسیخ''''کن فیکون''''روشنی کے لٹیرے''''تاجو قصائی''
''مکڑی'' ''کلونت کور کی واپسی'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

افسانہ کبھی کسی سماجی یا زندگی کے کسی واقعہ یا واقعات کا فنی اظہار ہوتا ہے جو ایک طرح سے مقصدی پہلو کی غمازی کرتا ہے اور کبھی تخیل کی بنیاد پر کوئی کہانی بُنی جاتی ہے جس میں فن کاری کا ہی زیادہ تر مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ راجہ یوسف کے افسانوں میں فن کے دونوں پہلو موجود ہے۔ افسانہ "نقش فریادی" کا متن افسانویت کی عمدہ عکاسی کرتا ہے کیونکہ کہانی کا کردار حسیاتی طور پر نفسیاتی اور ذہنی پیچ وخم کی گردش میں زندگی کا سفر طے کرتا نظر آ رہا ہے اور اس کی حساسیت ہمیشہ احتجاج کی دھیمی آنچ سے سلگتی رہتی ہے۔ لیکن یہ احتجاج بزور قوت نہیں بلکہ نفسیاتی احتجاج کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جیسا کہ ابتدا میں ہی کردار کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اسے اگر چہ اسکول کی طرف لئے جا رہا تھا لیکن یہ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے اس کی ماں سے دور کیا جا رہا ہے۔:

> ''جب میرے ہاتھ میں کھانے کا ٹفن دیا گیا اور کندھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا تو میرے دل میں جو پہلا احساس جاگا وہ احتجاج ہی تھا۔ مجھے میری ماں سے دور کیا جا رہا تھا۔''

اس طرح سے افسانے کی شروعات ہی نفسیات کے طفلانہ احتجاج سے ہوئی ہے پھر بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ یہ طفلانہ احتجاج پختہ صورت اختیار کر جاتا ہے اور کہانی کا روپ دھار کر رومان انگیز احساس میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن آخر پر یہی احتجاج احساس محرومی کا نقش فریادی بن کر فکری کینوس کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ افسانے کا متن نیم تجریدی اسلوب کی دلکش منظر کشی کر رہا ہے اور فنی ٹریٹمنٹ کا خوبصورت نقش پیش کر رہا ہے۔

اسی طرح افسانہ''مکڑی'' کا متن بھی تجریدی اسلوب کا حامل ہے۔ اس کے بیانیہ

میں فلسفیانہ لہجہ جگہ جگہ نظر آتا ہے اور خیال فلسفہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔اس طرح کا انداز گہری سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی جب تخلیق کار کسی موضوع پر گہرائی کے ساتھ سوچتا ہے تو فلسفیانہ اثر در آتا ہے۔جیسے افسانے کا ابتدائی فلسفیانہ انداز دیکھیں:

> ''احساس؟ ، تہہ دار سوچ میں فکر کے دھاگوں سے بنا مکڑی کا جالا۔اور مکڑی؟ دھاگوں کی اُلجھتی گرہ سلجھانے اور سلجھی گرہ کو اُلجھانے کا ہنر۔جو کبھی احساس کو جگانے کا کام کرتا ہے اور کبھی اسے گہری خاموشیوں کے سپرد کر کے میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ہنر نچوڑ ہے۔سوچ، فکر اور احساس کی تکمیل کا۔ہنر سے فعل لازم ہے اور جو فعل سرزد ہو جاتا ہے، اُسی کی سرزنش ہوتی ہے یا ستائش۔''

افسانہ نگار انسانی سوچ کو مکڑی کے الجھے دھاگوں سے تشبیہی دے رہا ہے اور نتیجہ عمل کو قرار دیتا ہے جس کی تعریف ہوتی ہے یا مذمت۔اس کے بعد کہانی پر رومانی فضا چھا جاتی ہے۔کردار محبوبہ کی خاطر اپنی جان کی پروا کئے بغیر بارود بھرے ہاتھوں سے بھی لڑ پڑتا ہے اور اپاہج ہو جاتا ہے۔آخر پر کردار کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے لیکن وہ سوچ کے دھاگوں میں ہی الجھتا رہتا ہے کیونکہ جس کے لئے اس نے یہ سب کچھ کر دیا تھا وہ اس کے جذبات اور وفاداری کا مذاق اڑاتی رہتی ہیں۔فنی طور پر افسانہ دلچسپ ہے البتہ تکنیکی طور پر کہانی میں اتنا الجھاؤ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار خیالات کی گہرائی میں خود بھی درمیان میں کہانی کے مرکزی تصور کو پیش کرنے میں الجھن کا شکار ہوا ہے۔جس کی وجہ سے افسانے میں احساس کی رو ہی بہتی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس افسانہ ''کلونت کور کی واپسی'' میں ماہرانہ بنت اور کہانی کے متاثر کن ڈرامائی انداز نے افسانے کو چار چاند لگا دے ہیں۔منٹو کے کردار کو اس ڈھنگ سے کہانی میں پیش کرنا اور کلائمکس میں نیا پن لانا کوئی آسان کام نہیں۔اس میں افسانہ نگار بخوبی کامیاب ہوا ہے۔

کیونکہ دونوں افسانوں میں انتقام کی تند وتیز لہریں دوڑ رہی ہیں۔رومانوی موضوعات کے افسانوں کی بات کریں تو افسانہ''نا قابل تنسیخ''ایک اچھا رومانی افسانہ ہے۔ افسانے کی ابتدا میں شعری اسلوب کا حامل ایک استعاراتی خیال یعنی "میں روئی جیسے گالوں سے بنے بادلوں کا باشندہ" دیکھ کر معروف فارسی شاعر کلیم کاشانی کا خوبصورت شعر یاد آیا:

گر بمستی آرزوئے ابر و باراں می کنم
سنگ می بارد ز ابر ِ پنبہ بر مینائے ما

(اگر کبھی عالم مستی میں ابر وباراں کی آرزو کرتا ہوں تو روئی کے گالوں جیسے بادلوں سے بھی میرے جام پر پتھر برسنے لگتے ہیں۔)

لیکن افسانے کی کہانی پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کے فرضی کردار کا جام پتھروں سے نہیں بلکہ پھولوں سے بھر گیا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ایک تخلیق کار ہے اور کہانی کا تانا بانا رومانی زندگی کی اضطراری کیفیات اور دلکش لمحات سے بُنا گیا ہے' جو کہ دور جدید کے برقی وسیلے یعنی سوشل سائٹس کی جدید مکتوب نگاری یعنی چیٹنگ کی فنی عکاسی کرتی ہے۔افسانے کا پہلا حصہ استعاراتی اور ابہامی نوعیت کا ہے جس میں مرد کردار ابہامی انداز سے اپنی محبوبہ کے حسن و جمال اور عشق کی سحر آمیز کیفیات کا تخلیقی اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔اس کے بعد کہانی سیدھا سوشل سائیٹ کی تعلق داری کی طرف مڑ جاتی ہے۔جس کے دوران کہانی میں ڈرامائی انداز کی کشمکش پیدا ہوتی ہے' جس میں عاشق اور معشوق کی جدائی کا قصہ درآتا ہے۔اور افسانے کا آخری حصہ پھر افسانوی انداز سے دونوں کو ملا دیتا ہے۔اس حصے میں افسانہ نگار کی گرفت بڑی مضبوط نظر آتی ہے۔کیونکہ نصف افسانے کے بعد افسانوی اسلوب' زبان و بیان اور کردار نگاری کی عمدہ تخلیقی منظر کشی سامنے آتی ہے جبکہ افسانے کا پہلا حصہ تھوڑا بہت علامتی اسلوب کے چکر میں ہی گھومتا رہتا ہے۔یہاں پر خود افسانہ نگار بھی شاید

سمجھ نہیں پایا ہے کہ خیالات کے جنگل میں وہ کہاں کہاں بھٹک گیا ہے۔۔اور چاندنی وشہزادی کی خیالی گردان تک ہی محدود رہتا ہے۔افسانے کا یہ مکالمہ بڑا اہم ہے کیونکہ اس میں قصہ آدم وحوا اور ایک تخلیق کار کی سوچ کو بڑی عمدگی سے موضوع متن بنایا گیا ہے:

''میں تیرے فعل کی مرتکب گردانی جاؤں گی۔ تجھے جنت سے نکال باہر کردیا جائے گا۔پھر مجھے تیرے ساتھ تیری خواہشوں کی تکمیل میں سرگرداں رہنا ہوگا۔۔۔نہیں نہیں میں کبھی تیرے قریب بھی نہیں پھٹکوں گی۔تیرے تصور میں بھی نہیں۔۔۔تیرے تخیل میں بھی نہیں''

''میں تخلیق کار ہوں۔اولادآدم ہوکر بھی وہ حرکات نہیں دہراؤں گا جن سے تم بے زار ہو۔مجھ سے بدظن ہو۔ تجھے تراش خراش کرمن موہک بنادوں گا۔ ایک تخلیق کار کی امر پریمیکا۔جس کی بس پوجا ہوگی۔''

مجموعی طور پرافسانہ اپنی ترسیل قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہے۔اب افسانہ'' برا آدمی''پرنظر ڈالیں تو افسانہ "برا آدمی" کی اٹھان رومانی فضا کی حامل ہے۔ماہی اوراس کی سہیلی کا مکالمہ دلچسپ ہے جس میں ساجد کے بارے میں گفتگو سے ظاہر ہے کہ واقعی کئی قسم کے چھچھورے لڑکے لڑکیوں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر خود کی عزت بھی مٹی میں ملا دیتے ہیں۔اس کے بعد کہانی ماہی کے کردار میں ایک سماجی ایشوخصوصا لڑکیاں جننے کے مسائل کی طرف مڑ جاتی ہے جو بالاخر طلاق تک پہنچتی ہے۔ یہاں پرافسانہ نگار نے اچھے ڈھنگ سے موضوع کو برتا ہے۔پھرآخر پرافسانہ دوبارہ ابتدائی موضوع کی طرف پلٹتا ہےاورایک خوشگوار تاثر چھوڑ کرختم ہوجاتا ہے۔افسانے کا تھیم دیکھ کرحضرت علی کا قول یاد آتا ہے' مفہوم یہ ہے کہ برے دوست سے بھی مکمل رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہے کیونکہ پانی کتنا بھی گدلا کیوں نہ ہوجائے پھر بھی آگ بجھانے کے کام آتا ہےاور ماہی کی زندگی کی مصیبتوں کی آگ کوواقعی برا ساجد بجھا ہی دیتا ہے۔فن اور کرافٹ کی بات کریں تو پلاٹ کئی جگہ منتشر ہوا ہے۔ابتدا کوچھوڑ کر بعد

کا طویل مکالمہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کس کردار کا کونسا مکالمہ (Dialogue) ہے۔ کرافٹ میں ڈرامائی تکنیک استعمال ہوئی ہے جو کہ بہتر ہے لیکن آخر پر ساجد اور ماہی کا واقع عجلت پسندی کا شکار ہوا ہے۔ کیونکہ اچانک ساجد کے گھر لوٹنے سے ہی اشارہ ملتا ہے کہ اب برا آدمی اچھا ثابت ہوگا۔

عصر حاضر کا تخلیق کار اگر کسی خطے کے جنگی ماحول میں سانسیں لے رہا ہو تو وہ مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ، اور بم و بارود جیسی جنگی فضا میں نفسیاتی طور پر داخلی کرب اور خارجی دباؤ کی زد پر رہتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اس کے لئے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ کس قدر حقیقت کو فن کے قالب میں ڈھال سکے تاکہ پڑھنے والے کے سامنے اس خطے کی صورتحال بھی سامنے آئے اور خود اس کو جان کے لالے بھی نہ پڑیں۔ اس قسم کے ادب میں علامتی اور استعاراتی اسلوب برتا جاتا ہے اور کبھی کبھی راست بیانیہ میں بھی حقیقت کو فن کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ کشمیر چونکہ پچھلی تین دہائی سے جنگی علاقہ (Combat zone) بنا ہوا ہے۔ اس لئے کشمیر کے تخلیق کار بھی شعر و فکشن کے کسی نہ کسی اسلوب میں یہاں کی گھٹن زدہ زندگی، مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ اور بم و بارود سے معصوم انسانوں کو ختم کرنے کے واقعات وحادثات کو کرب انگیز کیفیت کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ راجہ یوسف کے کئی افسانے کشمیر کے ان کرب ریز حالات کو کہانی کا روپ دیتے نظر آتے ہیں جن میں ''چیل، چنار اور چوزے''، ''بند کھڑکی کا کرب''، ''روشنی کے لٹیرے''، ''سبیل''، ''تاجو قصائی'' وغیرہ شامل ہیں۔

افسانہ ''چیل، چنار اور چوزے'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں چیل، چنار اور چوزے کہیں پر اپنی اصلی معنویت اور کہیں پر علامتی تفہیم کی مرکب معنوی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانے کا ابتدائی حصہ ایک پُر تناؤ ماحول کی علامتی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی

کردار ''نیلوفر'' جب صبح صادق کے قریب ''ہول ہول'' کی خوفناک آواز سنتے ہی نیند سے بیدار ہوجاتی ہیں تو وہ اس قسم کی خوفناک مانوس آواز سے خوف زدہ ہوکر پہلے اپنے دونوں بچوں کو نیند میں دیکھ کر اطمینان کی سانس لیتی ہیں اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھتی ہیں۔ باہر بستی کے لوگوں کی چیخ وپکار سنائی دیتی ہے اور وہ جب شور والی جگہ پر پہنچتی ہیں تو اسے پتہ چلتا ہے کہ چیل چوزے کو اٹھا کر لے اڑی ہے۔ افسانہ نگار نے اس سارے تناؤ شدہ منظر کو عمدہ علامتی اسلوب میں پیش کیا ہے:

> ''تب تک چیل چوزے کو لیکر اُڑ چکی تھی اور عورتیں چیختی چلاتی اور شور مچاتی ادھر اُدھ دوڑ رہی تھیں۔ بوڑھی عورتیں ایک طرف بین کر رہی تھیں۔ جبکہ مرد غصے میں ہونٹ کاٹ رہے تھے یا عورتوں کو ڈانٹ رہے تھے۔ عبدالرحمٰن کا جسم جیسے شل ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی سینہ کوبی کر رہی تھی۔ نیلوفر اور دوسری عورتیں آنسو بہاتے اس کو دلاسہ دے رہی تھیں۔ وہ غمگین ہوکر واپس صحن میں آ گئی اور چنار کی طرف دیکھنے لگی۔ پو پھٹنے کے باوجود اس کی گھنی چھاؤں میں ابھی بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور سنائی دے رہی تھیں تو چوزے کی دلخراش چیخیں۔''

اقتباس میں بظاہر چیل، چنار اور چوزے اور ہول ہول کی آواز مانوس لفظ و معنی معلوم ہوتے ہیں۔ ہول ہول وہ احتجاجی آواز ہے جو زیادہ تر کشمیر کی عورتیں اس وقت منہ سے نکالتی ہیں جب کوئی چیل اچک کر چوزے کو لے اڑتی ہے یا چنار یا کسی درخت پر گھات لگائے ہوتی ہے کہ کب چوزے پر پنجہ مار کر اسے لے اڑے اور اپنا شکار بنائے، تو عورتیں 'ہول ہول' کر کے اسے بھگاتی ہیں۔ افسانے میں نیلوفر کے کردار میں ایک جگہ چیل، چنار اور چوزے اور ہول ہول کو ان کے اصلی معنی میں بھی استعمال کیا گیا:

> ''تب نیلوفر بہت چھوٹی تھی جب ماں نے اس کو چوزوں کی رکھوالی پر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی چاق و چوبند رہنے کے لئے اکثر اُسے جھڑکتی بھی رہتی تھی

۔لیکن پھر بھی چنار سے دو چیلیں اُتر آتیں۔''

تاہم افسانہ نگار نے بڑی ہنرمندی سے ان مانوس اشیاء اور آواز کو علامتی اسلوب میں پیش کرتے ہوئے کشمیر کے خون آشام اور خوفناک حالات کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ کیونکہ اب چنار(ظالموں کے اڈے)' چیل (ظالم)' چوزے(کشمیریوں کے بچے) اور ہول ہول(ظلم کے خلاف کشمیریوں کی احتجاجی آواز)جیسی علامتیں افسانے کا حصہ بن چکی ہیں' اور افسانہ نگار نے کشمیر میں ہو رہے ظلم وستم اور جوانوں کو رات کے اندھیرے میں ظالموں کے ہاتھوں مارے جانے یا غائب کرنے کی بربریت کو خوبصورت فن کارانہ اسلوب میں کہانی کا حصہ بنایا ہے:

''ایک عرصہ سے سارا شہر چیلوں کا اسیر تھا۔ یہ چیل اب عام چیلوں جیسی نہیں لگ رہی تھیں۔ پتا نہیں کس نے اور کن سازشوں کے تحت ان کو آدم خور بنا دیا گیا تھا۔ اب چوزے، چرند پرند، انسان، سب ان کے شکار تھے۔ شہر کے مکین ان کے سامنے خود کو بے بس اور لاچار سمجھ رہے تھے۔ پورے شہر پر خوف اور مایوسی کا سایہ چھایا ہوا تھا۔ چیلیں چنار سے اُتر آتی تھیں اور کسی بھی ذی روح پر جھپٹا مار کر چنار کی گھنی شاخوں میں چھپ جاتی تھیں اور نوکیلے پنجوں سے چیر پھاڑ شروع کر دیتی تھیں۔ شہر میں بڑے پیمانے پر ہنگامے ہو رہے تھے۔''

یہاں پر مجھے افسانے کا پورا تجزیہ کرنا مقصد نہیں ہے پھر بھی مجموعی طور پر دیکھیں تو افسانہ ''چیل' چنار اور چوزے'' ایک عمدہ مذاحمتی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دیگر چند افسانوں میں بھی کشمیر کے پُرتشدد اور پُرآشوب حالات پر فکر انگیز کہانیاں نظر آتی ہیں۔ جن میں ''بند کھڑکی کا کرب'' (گمشدہ افراد کی داستان الم) ''روشنی کے لٹیرے'' (فوج کے چلائے گئے پیلٹ' چھروں' سے بچوں کی بینائی ختم کرنے کی کہانی) ''سبیل'' ''بزدل'' اور ''تاجو

قصائی''وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

''افسانہ''سبیل''کشمیر کے سیاسی اور فوجی لاک ڈاون یعنی کرفیو کے دوران کشمیریوں خصوصا مزدور طبقہ کی پریشانیوں اور مجبوریوں کو فکر انگیز انداز سے موضوع بنا رہا ہے۔کشمیر میں کرفیو واقعی ایک ایسا کالا دیو بن چکا ہے جو سینکڑوں کشمیریوں کو کھا چکا ہے۔کوئی بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور کئی کئی دنوں تک لوگ گھروں کے اندر قید ہو کر بھوک اور درد و تناؤ سے تڑپتے رہتے ہیں۔جیسا کہ کئی لوگ جانتے ہیں کہ جب ۲۰۱۸ء میں پانچ مہینے کے بعد کشمیر میں کچھ حد تک سوشل میڈیا پر سے پابندی ہٹادی گئی اور انٹرنیٹ سروس بحال ہوگئی تو کشمیر دوبارہ دنیا سے جڑ گیا۔اسی طرح مسلسل کرفیو کی وجہ سے کئی لوگوں کے کاروبار ختم ہو چکے ہیں تو ایسی صورت میں افسانے کے کردار سرتاج اور سارا کیوں نہ اپنے پیارے گھوڑے راکا کورات کے اندھیرے میں قصائی کو فروخت کر دیتے۔(گھوڑے کا گوشت کھانا مذہب میں بھی ممنوع ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی انہیں یہ کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔) وہ گھوڑا جو ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا' وہ دل پر پتھر رکھ کر اسے گھر سے نکالتے ہیں اور بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔قارئین افسانے کی کہانی سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کشمیری لوگ پچھلی تین دہائیوں سے کن کھٹن حالات سے گزر رہے ہیں اور اس افسانے کا مقصد بھی وہی ہے نہ کہ کچھ اور۔میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے افسانے وقت کی ضرورت بھی ہے تاکہ کشمیر یا کسی اور خطہ کی صورتحال باہر کے لوگوں تک پہنچائی جا سکے۔اسی طرح افسانہ''بزدل''کئی موضوعات پر فوکس کرتا دکھائی دے رہا ہے اور کہانی کا مجموعی دائرہ عصر حال کے خوں آشام ماحول کے سیاسی 'ثقافتی اور مذہبی منظر نامے کے اردگرد گھوم رہا ہے جو کہ نہ صرف کشمیر بلکہ دنیا کے کئی دوسرے خطوں میں بھی تناو کا باعث بنا ہوا ہے۔اس افراتفری کے عالم میں امن نامی کردار (بچہ) آخر تباہی کے بعد امن کا جھنڈا بلند کرتا ہے اور خوف زدہ عورتیں جھنڈا دیکھ کر راحت کی

سانس لیتی ہوئی جھنڈے کی جانب چل پڑتی ہیں۔افسانے کا مجموعی تاثر ٹھیک ہے اور بیانیہ علامتی اور راست بیانیہ کا مظہر ہے۔اس خوبی کے باوجود فنی اور لسانی طور پر افسانے کا جائزہ لیں تو افسانے کا پلاٹ کئی جگہ لسانی تصحیح کے علاوہ بیانیہ کے مستحکم انداز کا تقاضا کر رہا ہے۔کیونکہ جذبات کی رو نے کہانی کے برتاو کو ایسا منتشر کر دیا ہے کہ قاری افسانہ پڑھنے کے بعد صرف مجموعی تاثر پر ہی اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہے۔

راجہ یوسف کے افسانوں میں جو افسانے فن اور کرافٹ' کردار نگاری اور چست پلاٹ کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں' ان میں افسانہ ''تاجو قصائی'' مثالی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔موضوعاتی سطح پر افسانہ گاؤکشی کے قانون اور اس قانون کے پیش نظر سماج میں پھیلے تناؤ' اس کی آڑ میں ظلم وتشدد اور خوف وہراس کی اچھی فنی عکاسی کرتا ہے۔افسانے کی مرکزی کردار تاجو قصائی ہے جو اپنے پیشے میں ماہر ہوتی ہے۔اور اس کی یہ مہارت اس وقت کام آتی ہے جب اس کی چھوٹی بچی کی عزت ایک فوجی تار تار کرنا چاہتا ہے تو تاجو قصائی اچانک گھر میں داخل ہو کر فوجی پر قابو پا کر اسے بے بس کر دیتی ہے۔افسانے کا کلائمکس پورے افسانے کی روح معلوم ہوتا ہے:

> ''مفلر پوش کو غصہ آ گیا۔اس نے سلمیٰ کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا اور خود اس کے اوپر آ گیا...دروازہ دڑھام سے کھل گیا۔لیکن مفلر پوش کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کون آیا اور کون گیا۔اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔۔۔کھو پریل رسی کا پھندا اس کی ٹانگ میں پھنسا۔اور ایک لمحے میں رسی کی دوسری گانٹھ اس کی دوسری ٹانگ میں پھنس گئی۔اسے کھینچ کر کمرے کے بیچ تک گھسیٹا گیا۔۔۔جب کھرپیل رسی کی چبھن اس نے اپنی کلائیوں پر محسوس کی، تو اس کے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آ گئے۔ابھی وہ حالات کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ تاجو نے ایک ہاتھ سے اس کا مفلر

اُتارا۔گردن موڑ دی اور چھری نرخرے پر رکھ دی۔''

راجہ یوسف کا ایک افسانہ''کن فیکون'' سائنسی فکشن کے زمرے میں آتا ہے۔افسانے میں تین موضوعات یعنی خالق،تخلیق اور مخلوق کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔افسانہ نگار موضوعاتی سطح پر قاری کے سامنے یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں کہ اللہ تعالی (خالق) نے یہ کائنات (تخلیق) انسان (مخلوق) کی آرام وآسائش کے لئے بنائی تھی لیکن انسان نے اس کے نیچرل ماحول کو اس طرح سے بگاڑ دیا کہ وہ اب خود اس دنیا سے تنگ آکر خالق کائنات سے اس کو ختم کرنے کی گزارش کرتا ہے۔اس طرح سے افسانہ نگار نے ایک موضوعاتی پیش کش میں ایک سائنسی موضوع (جو سائی فی کے دائرے میں آتا ہے) کے توسط سے افسانے کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی احسن کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر راجہ یوسف کی افسانہ نگاری کا احاطہ کریں تو تین دہائی سے زیادہ عرصہ اس فن سے منسلک رہ کر وہ شعوری طور پر افسانہ لکھنے کے تخلیقی اسلوب کو برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔جس کی مثال ''نقشِ فریادی''،'' چیل،چنار اور چوزے''،'' مکڑی''،''سبیل''،'' تاجو قصائی''،وغیرہ افسانے ہیں۔ان کے افسانوں کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں کہیں کہیں پر ڈرامائی تکنیک کا استعمال اس انداز ہوا ہے کہ یہ تکنیک پلاٹ میں کہانی کے فنی استحکام میں کارگر ثابت نظر آتی ہے۔راجہ یوسف تخلیقی طور پر کسی بھی موضوع کو افسانوی قالب میں پیش کرنے کا ماہرانہ اسلوب رکھتے ہیں اور ان کے افسانے،قاری کو کسی بھی الجھن میں ڈالنے کے بجائے راست انداز سے اپنا پیام پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

Address: Wadipora,
Handwara, Kashmir -193221
Email:drreyaztawheedi777@yahoo.com
Cell:7006544358

نقش فریادی

میں نے اس میں اپنی مرضی سے رنگ بھرنا چاہا۔ پر جو کچھ اُبھر کر سامنے آرہا تھا وہ میرے لئے غیر مانوس تھا۔ جس کی پہچان بہت مشکل تھی۔

جب میرے ہاتھ میں کھانے کا ٹفن دیا گیا اور کندھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا تو میرے دل میں جو پہلا احساس جاگا تھا وہ احتجاج تھا۔ مجھے میری پیاری ماں سے دور کیا جا رہا تھا۔۔ میرا ہاتھ دادا کی گرفت میں تھا۔ میں گیٹ تک مڑ مڑ کے دادی کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اب یا جب وہ بھی میرے احتجاج میں شامل ہو جائے گی۔ وہ مجھے روک لے گی۔۔ پر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ دادا دادی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔۔۔ اور ان کی آنکھوں کی یہ چمک مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔۔۔ میرا اسکول کا یہ پہلا دن ایک صدی کے برابر ہو گیا تھا۔

''تم نے میری پنسل کیوں توڑ دی۔ میں تمہاری بک پھاڑ دوں گی۔'' اس نے صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ میری کتاب کے کئی ورق پھاڑ بھی ڈالے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو میرا احساس جاگا تھا، جس میں احتجاج نہیں تھا۔۔۔ میرے برش سے رنگ ٹپک رہے تھے۔ پر کینوس پر ابھرتے نقوش مانوس نہیں تھے۔

''تمہاری امی میٹھا اچھا بناتی ہے۔'' میں نے اس کو ماں کی بنائی ساری مٹھائی کھلا دی ۔۔۔ مٹھائی کی شہد ایسی مٹھاس اس کی آنکھوں میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی اور میرا شوق بڑھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں چوم لوں۔

میں اپنے ذہن کے کینوس پر بڑے شوق سے اس کا خوب صورت پیکر تراشنا چاہتا

تھا۔لیکن وہاں کوئی پیکرنہیں بن پا رہا تھا۔البتہ مبہم لکیریں ایک جالا جیسا بُن رہی تھیں ۔ میرے تصور کے سمندر میں اس کا عکس ڈوبتا اورا بھرتا جار ہا تھا۔ یہ ہلکا سا، غیر مانوس سا پیکر میرے بچپن کے اس کھلونے جیسا تھا جو دکا ندار کے شوکیس میں تو پڑا تھا، پر رات رات بھر میرے سپنوں کے ساگر میں کبھی مدھم تو کبھی جھلملاتا ابھرتا ڈوبتا رہتا تھا۔۔۔دھندلا ہی سہی کچھ تو تھا جس کی تصویر اکثر بادلوں میں تحلیل ہوجاتی تھی اور کبھی پورے چاند پر اس کا خوبصورت عکس منعکس ہوجاتا تھا۔ ایک پیکر، ایک عکس، شفاف مورتی جیسا۔جس کے چہرے کے گرد ہلکا ہلکا سا دھندلا پن تھا۔جس وجہ سے یہ تصویر دھواں دھواں سی دِکھائی دے رہی تھی۔۔۔بس ایک غیر مانوس سا عکس تھا۔ یا نہ سمجھ میں آنے والا پیکر تھا، جو کبھی مکمل تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔ پر میں نے اپنے کینوس پر مبہم سا ہی سہی ایک پیکر تراش ہی لیا، جس میں میں ہر وقت نئے نئے رنگ بھرتا رہتا تھا۔شوق رنگوں سے رنگا میرا یہ خیالی پتلا ہمیشہ سفید بادلوں جیسی کتاب پر کالے کالے حروف کی طرح ابھرکرآتا تھا۔لیکن۔۔۔افففف یہ دھند۔۔۔۔ یہ دُھند میری سوچ کا حصہ تھی یا میری آنکھوں کا دھوکہ۔۔ یا کہ ابھرتی ڈوبتی تصویر کی لکیریں اتنی ہلکی تھیں کہ وہ پل بھر میں تیز ہوجاتی تھیں اور پل بھر میں مدھم پڑ جاتی تھیں۔کبھی کبھی تو میرا تراشیدہ پیکر دھند کے ایسے اتھاہ سمندر میں گم ہوجاتا تھا کہ میری روح تھرتھر کانپ اٹھتی تھی اور میرا یقین بڑھ جاتا تھا کہ اب یہ پیکر ڈوبا تو کبھی ابھر کر آئے گا نہیں۔لیکن پھر ایک لمحے میں یہ کالے بادلوں کی اوٹ میں دوبارہ دکھائی دیتا تھا۔

''آپ کتنی شکر لیں گے۔''

''ایک چمچ۔''

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے''

''تو۔۔۔پھر کیوں پوچھا؟''

''وہ تو میں نے آپ کی چپ توڑنے کے لئے کہا۔ آپ بہت کم بولتے ہیں نا۔''

''تم بھی تو خاموش خاموش سی رہتی ہو۔ کچھ کہتی بھی نہیں ہو۔''

''کیا کہوں، آپ تو صرف میرے چہرے کو گھورتے رہتے ہیں۔ میں تو کبھی کبھی ڈر جاتی ہوں''

''ہاں رنگوں کی تلاش میں ہوں۔تم میں کون کون سا رنگ بھرا ہے، انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تم میں اپنی مرضی کے کچھ رنگ بھرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے برش رنگوں میں ڈبو دیا تو ریسٹورانٹ کا سارا رنگین منظر مدہم پڑ گیا۔ میں نے سارے رنگ بکھیر دیئے۔۔رنگوں میں سارا جوش، جذبہ، چاہت اور بھرپور محبت ڈال دی۔اب مدھم لکیریں ایک پیکر تراش چکی تھیں۔ وہ خوش رنگ اور خوش نما ابھر کر آ گئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں مستی تھی۔ گالوں میں چاشنی، ہونٹ مدھ بھرے سے تھے، دانت موتی جیسے اور اس کی مسکراہٹ پر ہزار جان قربان کرنے کو دل چاہتا تھا۔۔۔محبت پروان چڑھتی رہی۔۔۔شوخیاں بڑھتی گئیں۔ چھیڑ چھاڑ کی رُت برستی رہی۔۔۔قدرت کے حسین نظاروں کے سیر سپاٹے شروع ہو گئے۔۔۔سمندر ایسی گہری آنکھوں میں محبت کی سیپ کی تلاش مقصدِ حیات بنی۔۔۔محبت ، چاہت، اور لذت کے ذائقے بے صبری کے پیمانوں میں بٹتے گئے ۔۔۔زندگی کے جھمیلے روشنی کے قمقموں جیسے ہوتے ہیں۔کبھی سورج کی تیز اور چھپاک کرنوں کی طرح آنکھوں میں چکا چوند کر دیتے ہیں، تو کبھی پورے وجود کو چاندنی جیسی سہانی ٹھنڈک سے تھپکی۔۔۔ ابھرتی ڈوبتی لہریں کبھی منجدھار میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیتی ہیں تو کبھی اٹھا کر ساحل کے اوپر پٹخ دیتی ہیں۔۔۔

گردشِ ایام کا پہیہ بہت تیزی کے ساتھ گھومتا رہا اور پھر ایک دم مدہم پڑ گیا۔ جیسے تھمنے کے بہت قریب آ گیا ہو۔۔۔اب تو ساری دنیا بدلی بدلی سی دِکھائی دے رہی تھی۔۔۔ذہن

کے کینوس پر اُبھری مورت بھی بدل بدل سی لگ رہی تھی۔۔۔ یا شاید یہ وہ تھی ہی نہیں جس کو میں نے بڑے پیار سے تراشا تھا۔ جس کے انگ انگ میں میں نے اپنے رنگ بھر کر اپنی مرضی کا پیکر بنانا چاہا تھا۔۔۔ یہ جو میرے ذہن کے کینواس پر صورت ابھر کر آ رہی تھی، اسے تو میں نے تراشا ہی نہیں تھا۔۔۔ میں نے تو ایک حسینہ کو بہت حسین سانچے میں ڈھالا تھا ۔۔۔ جس کا چہرا اپنے حسن و جمال میں لاثانی تھا۔۔۔ پر یہ جو چہرا کینوس پر ابھر کے آ رہا تھا، یہ تو یاس ، ناامیدی اور فکر کے دھاگوں میں الجھا جھریوں سے بھرا چہرا تھا۔۔۔ افففف ۔۔۔آج مجھ میں یہ کیسا احساس جاگ رہا تھا۔۔ بہت ہی کمزور۔۔۔نحیف ۔۔۔اور۔۔۔ لاغر سا۔۔۔ میرا ہاتھ میرا آئینہ بنا۔ میں نے خود میں خود کو دیکھنے کی سعی کی ۔۔۔ ماہ و سال بدلنے سے میرے بھی خد و خال بدل چکے تھے۔۔۔ میرا چہرا تفکر کی اُلجھی جھریوں سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔۔۔ اور نقش فریاد کرر ہا تھا کہ تم ناکام رنگ ساز ہو۔

☆☆☆

مکڑی

احساس؟ تہہ دار سوچ میں فکر کے دھاگوں سے بنا مکڑی کا جالا۔

اور مکڑی؟ دھاگوں کی اُلجھتی گرہ سلجھانے اور سلجھی گرہ کو اُلجھانے کا ہنر۔ جو کبھی احساس کو جگانے کا کام کرتا ہے اور کبھی اسے گہری خاموشیوں کے سپرد کر کے میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ ہنر نچوڑ ہے۔ سوچ، فکر اور احساس کی تکمیل کا۔ ہنر سے فعل لازم ہے اور جو فعل سرزد ہو جاتا ہے، اُسی کی سرزنش ہوتی ہے یا ستائش۔

مکڑی جب اُلجھاؤ اور سلجھاؤ کی اُلجھن میں پھنس جاتی ہے۔ وہ تار بُننا بھول جاتی ہے۔ ہنر کے تخلیقی پرزوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ وہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل رک جائے تو سوچ منجمد ہو جاتی ہے۔ سوچ کا منبع تو عقل ہے اور عقل کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔

میں اس مکڑی کے اُلجھاو اور سُلجھاو کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ میرا احساس شاید مر چکا تھا۔ اگر مرا نہیں تھا۔ تو میری ہنر کی چابی زنگ آلودہ ہو چکی تھی۔ میں کیا تھا؟ میں کیوں تھا؟؟؟ میں کون تھا؟؟؟ میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے ایک شخصیت اُبھر کے آجاتی ہے۔ کام جس کی پہچان بن جاتی ہے۔ میری پہچان گم تھی۔ نہ میری سوچ کا آکار ٹھیک تھا نہ ہی میرا کام میری پہچان تھی۔ میں ہونے کے باوجود بھی جیسے تھا ہی نہیں۔ جیسے میرے وجود کا کوئی معنیٰ ہی نہیں تھا۔ کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔۔۔

اُس کے کرتوت ان کو ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ یہی بولے تھے وہ۔ اُس کی غزال آنکھیں۔ اُس کے دراز گیسو۔ اُس کا سجنے سنورنے کا دلکش انداز اور اُس کا بے باک رنگ

ڈھنگ۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اُن کو بھی نہیں جن کے ہاتھ بہت لمبے تھے....لمبے ہی نہیں بلکہ ان کے ہاتھ بارود بھرے تھے۔ یہ لوگ جب کسی کے دشمن ہو جاتے تھے تو اس کی پشت پر چاہے پورا گاؤں ہی کھڑا کیوں نہ ہوتا۔ یہ پورے کا پورا گاؤں بارود کی ہلکی چٹکی سے راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔ جس کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ ویسے بھی ان کے سامنے ہر کوئی جھکتا تھا۔۔۔ وہ طاقتور تھے اور طاقت ور کے سامنے ہر کمزور شخص جھکا رہتا ہے۔ طاقت ور بھی خود کو وقت کا خدا سمجھتا ہے۔ اس کو جھکے ہوئے لوگ اچھے لگتے ہیں.....یہ سارے طاقتور، بارود کے سوداگر اس غزالہ کے دیوانے تھے۔ ہر کوئی دوسروں سے آنکھ بچا کر اسے آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی عیاشیوں کے لئے ننگا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی ایک دوسرے کو کان و کان خبر کئے بغیر۔۔۔لیکن وہ میری دیوانی تھی۔۔۔ دیوانی۔؟؟؟ ہاں تب مجھے یہی لگتا تھا۔ صرف لگتا نہیں تھا مجھے اس پر یقین تھا۔ تبھی تو وہ کسی کی پروا کئے بغیر میری ہوگئی تھی۔ ہمارے دن سہانے اور راتیں رنگین تھیں کہ وہ سب کود پڑے۔ ان سب نے اپنی اپنی جگہ مضبوط اور چست پلان بنالیا تھا۔ لیکن یہ ان کی بدنصیبی تھی۔ سب سے پہلے میں آ گیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ہم نے ایک دوسرے کی نیت پہچان لی۔ میں پہلا باغی بنا تھا۔ پھر ہم سبھی ایک دوسرے کے باغی بنے، لیکن میں کوئی پروا کئے بغیر ان سے بھڑ گیا۔ ناکامی ان کی موت بنتی۔ وہ کہاں برداشت کرتے۔ انہوں نے سارا سیسہ پگھلا پگھلا کر میرے شریر میں اُتار دیا۔ لیکن اُنہیں پھر بھی بھاگنا پڑا۔ اسے خراش تک بھی نہ آنے دی۔ وہ سلامت تھی۔ اور اس کی عزت بھی محفوظ تھی۔ میں تو اسے اپنا فرض سمجھ کر بھول بھی جاتا لیکن وہ میری اور بھی زیادہ دیوانی ہوگئی تھی۔ میں بچ تو گیا لیکن میرا آدھا شریر بے کار ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔تب وہ دیر تک مجھے سہلاتی رہتی تھی۔ مجھے اپنا محسن، اپنا پیار بتاتی رہتی تھی۔ میں بھی اس کے جھانسے میں آ گیا۔ نہیں وہ جھانسہ تھوڑی تھا۔ وہ تو میری خود غرضی تھی۔۔۔میرا

لالچ تھا۔۔۔ایک اپاہج کی خودغرضی۔۔۔یا اسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کہیئے۔۔۔جو بھی تھا لیکن اسے لالچ سے مبرا تو نہیں کہا جاسکتا۔۔۔

جج میرا کیا فیصلہ سناتا۔وہ مجھے کیا سزا دے دیتا۔مجھے اس پر ہنسی آرہی تھی۔ لیکن میں خوش بھی ہورہا تھا۔میں دیکھنا چاہتا تھا جج مجھے کیا سزا سنائے گا۔تب مجھے جج کی سوچ، اس کی عقل پر بہت ہنسی آرہی تھی۔میں بہت دیر تک اس پر ہنستا رہا۔اس کے فیصلے پر قہقہے مارتا رہا۔۔۔

اس کے پیار کی پرتیں اب کھل چکی تھی۔وہ مجھے بے کار شئے سمجھ کر بے اعتنائی کا شکار بنارہی تھی۔میرے اپاہج پن کا بھرپور فائدہ اُٹھارہی تھی۔وہ میری سوچوں میں اپنی مکڑی کے جالے بننے کی کوشش کرتی رہی اور وہ کامیاب بھی ہوگئی۔میرے تخلیقی پرزوں میں زنگ کی محرک بھی وہی تھی۔ساتھ ہی میرے احساس کو کچوکے بھی لگائے جارہی تھی کہ دیکھ میں جو کررہی ہوں۔تمہارے سامنے کررہی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر کررہی ہوں۔میں تو پہلے پہل اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔پھر ایسا کرنا اس کا بھولا پن لگا۔لیکن جب سوچ کے تانے بانے بکھیرنے میں اس کی راست مداخلت دیکھی تو یقین ہوگیا کہ یہ اس کی ضد تھی۔وہ جان بوجھ کر میرے ٹوٹے پھوٹے وجود کے ساتھ ساتھ میری ذہنی حس کو بھی اپاہج بنادینا چاہتی تھی..... ہاں یہ اس کا بھولا پن نہیں تھا۔ یہ میری سوچ کا بکھراؤ بھی نہیں تھا۔بلکہ یہ اس کی ضد تھی۔مجھے میرے جسم کے ساتھ ساتھ مجھے ذہنی طور بھی اپاہج بنانے کی اس کی ضد ۔۔۔

جج نے مجھے پھانسی کی سزا سُنادی۔یہ بھی کوئی سزا تھی۔پھانسی پر تو میں بہت پہلے چڑھ چکا تھا۔کئی بار قسطوں میں چڑھا تھا۔جب میں اپاہج ہوگیا اور وہ میری دیوانی۔سب سے پہلے میں غفلت کی سولی چڑھا اور اپنی فکر کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوادیا تھا۔میری سوچ کے

ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور میری حس کے بے رونق چہرے پر کالا ماسک چڑھا دیا گیا تھا۔ جس دن وہ میرے سامنے میرا مذاق اُڑاتی ساتھ والے کمرے میں ۔۔۔۔۔ میری محبت کے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی ۔۔۔ مجھے جذبات کے سلگتے توے پر لٹا کر خود واسنا کے ٹھنڈے شاور سے نہایا کرتی تھی ۔ وہی تو دن تھا جب میری سوچ منجمد ہوگئی تھی ۔ میرا تخلیقی ہنر زنگ آلودہ ہوگیا تھا۔اور میں نے دونوں کا قتل کر دیا.......لیکن تب میں زندہ کہاں تھا اور وہ ان کا قتل کہاں تھا۔ میں نے کب کسی کو مارا تھا۔ وہ میری سوچ کی مکڑی کا قتل تھا۔جس نے جھالے بنانے چھوڑ دئے تھے۔ جو مجھے میرے احساس تلے ہی مار دینا چاہتی تھی۔ اسے پہلے کہ وہ مکڑی مجھے مار دیتی۔ میں نے اس کا قتل کر دیا......

اب جج نے کسے موت کی سزا سنائی تھی...مکڑی کو... یا.....احساس کو......مکڑی تو پھندے پہ جھول گئی تھی ۔۔۔لیکن یہ احساس....کاش یہ احساس بھی کبھی مر جاتا۔

☆☆☆

نا قابلِ تنسیخ

وہ روشنی کی شہزادی تھی۔ میں روئی جیسے گالوں سے بنے بادلوں کا باشندہ۔ میں اسے ہمیشہ روشنیوں کے سہارے ہی دیکھتا تھا۔کبھی چاندنی کی نورانی کرنوں میں اس کا عکس ابھر آتا تھا تو کبھی سورج جیسی روشنی میں اس کے مدھم مدھم نقوش میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتے تھے۔ جب کبھی وہ میری طرف اپنی مسکراہٹ کے پھول اچھال دیتی تھی تو وہ شام میرے لئے شامِ عشرت میں بدل جاتی تھی۔۔۔ایک دن میرے نرم بادلوں کے دیس میں چاندنی کی برسات ہوئی تو میں نے دونوں ہاتھوں سے دامن پھیلا کر ساری چاندنی اپنی جھولی میں بھر لی۔ چاندنی کے ذرے ذرے میں شہزادی کا عکس منقش تھا۔تب مجھ پر یہ راز منکشف ہوا کہ چاند کی اپنی کوئی رمق نہیں ہوتی۔ یہ تو روشنی کی شہزادی کا حسن ہے جس کا عکس چاند کی بے نور آنکھوں میں نور بھر دیتا ہے اور وہ اپنے سارے اردگرد کو اپنی نورانی چاندنی سے نہلاتا ہے۔۔

ایک مست شام کو چاندنی مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی کہ میرے سارے برفیلے وجود میں سورج جیسی گرمی بھر گئی۔شہزادی کی باتیں مجھے اپنی حدت سے پگھلا رہی تھیں اور اس کی سرگوشیاں الفاظ کے معنٰی کھو رہی تھیں۔۔۔اس کی محبت جیسے مدھر، مٹھاس، رس بھرے ساگر میں گھل رہی تھی اور بھاپ بن کر ٹپ ٹپ میری بے باک سوچ پر گر رہی تھی۔ میرے ذہن و دل کو بس میں کر کے میرے سارے وجود کو سیراب کر رہی تھی۔۔۔

روشنی کے دھاگوں سے کڑھا ہوا شہزادی کا عکس اب روز مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا۔

’’تم کب کب مجھے یاد کرتے ہو‘‘

''یہ پوچھو کب یاد نہیں کرتا ہوں ۔ تیری چاندنی تو جھلمل جھلمل کرتی میرے دل کے نہاں خانوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔ میرے وجود کے سارے اندھیرے تیری روشنیوں سے روشن ہیں۔ تیری یاد نہ آئے تو من کی ساری روشنیاں گل نہ ہو جائیں گی۔ ''

''اپنے دل میں کس کس کو بسا رکھا ہے۔''

''تصورات میں بسی مبہم اور غیر مانوس سی سیاہی جو کونوں کھدروں میں کائی کی طرح جمی تھی ۔تجلی کا تاب نہ لا سکی ۔سارے طور سور ہو گئے ۔ سیاہی کے بت ریزہ ریزہ ہو گئے ۔ عبادات کو ایک روشنی ملی ۔اب تو سارے راستے منور ہیں ۔روشنی میں کہاں الگ الگ خانوں میں الگ الگ خدا ٹک پاتے ہیں ۔ایک صورت ،ایک مورت کے جوگی کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''اففف ۔۔۔۔'' اس کی تاسف بھری پھنکار۔

''یقین دلانے کے میرے پاس ہزار دعوے ہیں ۔ پر وہ پیار ہی کیا جہاں حربے آزمائے جائیں ۔۔۔جتن کرنا بھلا دو ۔ دل کو گواہ کر لو ۔ یقین کے دروازے وا ہو جائیں گے ۔نگاہوں کا ایک مرکز ہو جائے گا۔تصورات پر ایک ہی صورت منعکس ہو جائے گی ۔

''مجھے چاند اور چاندنی سے جدا کر کے دیکھو گے تو دل بھر جائے گا ۔ نہ شہزادی کا بھرم رہے گا نہ اجالوں کے آفاقی تجلی کا تصور ہی ہو گا۔تم بھی بادلوں سے اتر آؤ گے تو زمینی حادثات میں دفن ہو کر رہ جاؤ گے۔''

''کیوں اتنی جلدی تخیل کے گہرے نیلے سمندر کو جلتی ریت سے پاٹ دینا چاہتی ہو۔ کیوں آکاش کی گہری وسعتوں کو کالے بادلوں سے ڈھک دینے کی متمنی ہو۔ زمینی سوچ میں دلدل ہوتے ہیں ۔ خاردار راستے ہوتے ہیں ۔ ریتیلے صحراؤں میں پیروں کے تلوے جلتے ہیں ۔تخیل کی وسعتیں لامحدود ہوتی ہیں ۔۔۔تصورات کے پر ہوتے ہیں ، پیر نہیں ۔

اڑانوں پر کوئی قید نہیں ۔کوئی قدغن نہیں ہوتی ۔۔۔آ ۔میری آفاقی سوچ میں بس جا۔ میرے بحر بیکراں جیسے سینے پر اپنا سر رکھ دے۔ میرے تخلیقی بازوؤں میں سما جا۔ایک نئی کہانی کو جنم دیں گے۔جو امر ہوگی۔لافانی ہوگی۔

’’میں تیرے فعل کی مرتکب گردانی جاؤں گی ۔ تجھے جنت سے نکال باہر کردیا جائے گا۔پھر مجھے تیرے ساتھ تیری خواہشوں کی تکمیل میں سرگرداں رہنا ہوگا۔۔۔نہیں نہیں میں کبھی تیرے قریب بھی نہیں پھٹکوں گی ۔تیرے تصور میں بھی نہیں ۔۔۔تیرے تخیل میں بھی نہیں‘‘

’’میں تخلیق کار ہوں ۔اولادِ آدم ہوکر بھی وہ حرکات نہیں دہراؤں گا جن سے تم بے زار ہو۔ مجھ سے بدظن ہو۔ تجھے تراش خراش کر من موہک بنادوں گا ۔ایک تخلیق کار کی امر پریمیکا۔جس کی بس پوجا ہوگی۔‘‘

’’اففف ۔۔۔۔۔۔۔ ھاھاھاااا ‘‘

’’تیرا یہ تاسف اور اس تحقیر کو کس معنٰی میں لوں میں ۔۔۔‘‘

’’کہانیاں گھڑنے والے صورت کو مورت بنانے کی فکر میں خود کو کرداروں میں گم کر جاتے ہیں ۔اپنی ساری حرارت خیالی اپسراؤں کے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ۔ چاشنی سے لبالب سارا جوش تراشیدہ پیکروں میں انڈیل دیتے ہیں۔جذبات میں شدت اور شریر میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو جنون کے ہتھے چڑ جاتے ہیں۔جنوں کے بہاؤ میں بہہ جاتے ہیں ۔تیز بہاؤ جب کنارے پر اچھال دیتا ہے تو ٹھنڈے پسینے میں تر بتر ہوتے ہیں ۔۔۔تم سوچوں میں الجھے لوگ ظاہری رچاؤ بساؤ میں بہت پھیکے ہوتے ہو۔ ‘‘

میں جلدی جلدی مسینجر سے لاگ آوٹ ہوگیا۔ پھر گھبراہٹ میں کمپیوٹر ہی شٹ ڈاون کردیا۔کافی دیر تک انگلیاں بالوں میں پھرتا رہا۔قوت ارادی یکجا کرنے میں مجھے کافی

دیر لگی۔اس نے میری تخلیقی صلاحیت کا مذاق اڑایا تھا۔میری قوت بشری کو چلینج کیا تھا۔۔۔ میں کافی دیر تک اس بات پرغور کرتا رہا کہ کیا واقعی ایک تخلیق کار خیالی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے جس کا ظاہری رچاؤ بساؤ پھیکا ہوتا ہے۔ہم تو کرداروں کو فاتح بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔خود کیسے کاغذی گھوڑے ثابت ہوسکتے ہیں۔چاہے میدان عملی ہو یا تخلیقی۔

میں نے اداسیوں کے سمندر پر عارضی خوشی کا برش پھیر دیا اور سر پر کالے بادلوں کا سائبان پھیلا دیا۔اب نہ چاندنی ہی جھلمل جھلمل کرتی میرے وجود سے ٹکراتی تھی اور نہ شہزادی کا عکس ہی میرا مذاق اڑانے کے لئے سامنے آتا تھا۔

لیکن میرا یہ عارضی سکون تب درہم برہم ہوگیا جب اچانک بادلوں نے مجھے اپنے دیش سے باہر اچھال دیا۔۔۔میں ہوا میں ہچکولے کھاتا رہا۔۔۔لیکن یہ نہ جان پایا کہ گر رہا ہوں کہ تیر رہا ہوں۔۔۔شہزادی سے چھپا رہنے کا یہ عارضی خول میرا شکنجہ بنا۔جس میں میرا سارا وجود جکڑا گیا۔۔۔مجھے وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا۔۔۔مجھے لگا دور کہیں چاندنی اب بھی چھن چھن برس رہی ہے۔۔۔اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شام کو منور کر رہی ہے۔۔۔۔شہزادی کسی اور کی راتوں کو رنگین بنا رہی ہے۔۔۔۔بس اک میں ہوں جس کی کوئی بھی شام تب سے شامِ عشرت نہ بن پائی تھی۔۔۔۔میری ہر شام اب۔۔۔شامِ غم بنی ہوئی تھی۔۔۔۔

تنہائی اور بے اعتنائی کی یہ سیاہ اور وحشت زدہ رات بہت مختصر رہی۔شہزادی نے بھی یہ دن بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔مجھ سے دور رہ کر وہ بھی خوش نہیں تھی۔۔۔وہ بھی جذبات کی بھٹی میں سلگتی رہی تھی۔اس کا وجود بھی میری گرم سانسوں کا متلاشی تھا۔۔ہجر و جدائی کا یہ موسم اس کے لئے بھی جان لیوا بن چکا تھا۔۔۔ آخر چاندنی کالے بادلوں میں روزن تلاشنے میں کامیاب رہی۔اور میری آنکھوں کو خیرہ سر کرگئی ۔۔۔

جب میری بےقراری حد سے بڑھ گئی اورشہزادی کوبھی کسی کروٹ چین نہ آ رہا تھا تو ہم نے اس سائنسی طلسماتی چکرویو سے باہر آنے کا فیصلہ کیا ۔۔۔

شہزادی نے میرے بازو پرزور سے کاٹا۔۔۔میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔اس کی آنکھوں کے اسکرین پر بے ترتیب مدوجزر کا ابال تھا۔۔۔کچھ دھندلا دھندلا سا عکس ابھر رہا تھا۔۔۔آدم کا خلد سے نکالے جانے کا منظر کبھی ابھرتا اور کبھی ڈوبتا ہوانظر آرہا تھا۔۔۔شہزادی کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ ابھر کر آرہی تھی اور اوپری ہونٹ پر ننھی ننھی سی شبنمی بوندیں پھوٹ رہی تھیں۔آنکھوں کا تجسس اور ہاتھوں کی بے چینی اسے بےقرار بنائے ہوئے تھی۔وہ بار بار اپنی مٹھی بند اور کھول رہی تھی جیسے اپنا دہکتا وجود اپنے ہاتھوں میں بھر کر مٹھی بند کرنا چاہتی تھی ۔۔۔میں جو کرداروں کو فاتح بنانے کا ہنر جانتا تھا۔۔۔میں ایک تخلیق کار ایک نئ کہانی کو نیا آ کار دینے کی سعی کرر ہا تھا۔۔۔ہاتھ بڑھایا تو حوا کی بیٹی ساری کی ساری میرے وجود کا حصہ ہوگئی۔۔۔ہمارا ملن ناگزیر تھا۔۔۔ہمارا فعل نا قابل تنسیخ تھا۔۔۔

☆☆☆

کلونت کور کی واپسی

''ارے وااااہ۔۔۔میری بلورانی آج کل کیا پڑھ رہی ہے۔''

''تیرے کام کی چیز نہیں ہے دیدی۔۔۔رہنے دو۔۔''

''پھر بھی تو دکھاؤ کیا ہے۔'' بڑی بہن شفق نے کتاب ہاتھ سے چھین لی اور دیکھتے ہی نیچے پھینک دی۔''

''ارے یہ۔۔۔چھی چھی چھی ۔۔۔پھر سعادت حسن منٹو۔۔۔یہ کیا پڑھتی ہو بلورین؟''

''اوہو شفق دیدی۔۔۔ بتایا تھا نا تیرے مزاج کی چیز نہیں ہے۔''

''کتنی بار کہا اسے مت پڑھا کر۔اس کو پھر پڑھا تو امی کو بتادوں گی۔''

بلورین اپنی معصوم بہن شفق کو یاد کرتے ہی رو پڑی۔شفق شادی کے بعد صرف پندرہ دن زندہ رہی۔اس کی موت سے سارے علاقے میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔لوگوں میں اس کے شوہر گاما کے لئے نفرت تھی۔انہیں شفق کی بے وقت موت نے دکھی کر دیا تھا۔ کھرچنا، پھاڑنا، اتارنا گاما کا شیوہ تھا۔جو اس کے پنجے میں پھنس جاتی تھی جیسے چیل کے پنجے میں چوزہ۔تڑپتی پھڑ پھڑاتی رہ جاتی تھی۔یا جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھی۔گاما پڑوس کی بستی کا بدمست غنڈہ۔اصل نام گلاب چند۔خصلت ببول جیسی۔نہ عقل کا نہ شکل کا۔بس سانڈ جیسے قد کاٹھ کا۔جاہل اتنا کہ کوئی قریب نہ پھٹکتا۔سرکش اتنا کہ حاکم بھی سر پر ہاتھ رکھ کر فخر کرے۔شریف اسے دور بھاگتے تو نیتا اسے سر پہ بٹھاتے۔بے وجہ لڑائی جھگڑے میں پڑنا، کبڈی کھیلنا اس کے خاص مشغلے۔کبڈی میں اتنا پھرتیلا کہ سامنے والوں کو خاک

چٹائے۔اگلی ٹیم کے دو دو بندے ہاتھوں میں اٹھا کر لائے اور اپنی بونڈری میں پٹھک دے۔ تماشہ گیر گاما گاما چلاتے تو لوگ اصل نام گلاب چند بھول گئے اور یہ گاما پہلوان ہو کر رہ گیا۔ غرور گھمنڈ میں اندھا اتنا کہ ماں بہن کا کوئی لحاض نہیں۔ بد مذاق چمچوں کی ٹولی میں خود کو راجہ سمجھتا۔اس کے چمچے اس کی راہ میں کیلے کے چھلکے اور زبانی خرچ والی مکھن کی چکنائی سے پھسلن بنانے کا ہنر جانتے تھے اور گاما کو پھسلنے میں مزا آتا تھا۔ پہلے پہل نشہ کر کے سیدھا کوٹھے پہنچتا۔ٹولی کے ایک بدخواہ نے راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے کی ترغیب دی۔اس کام کو کرنے میں اتنا مزا آیا کہ اپنا مشغلہ ہی بنا دیا۔کسی بھی باکرہ کو اٹھا لینا اور دو چار دن کے بعد واپس پھینکنا اس کا معمول بن گیا۔آس پاس کے لوگ اتنے پریشان کہ بستی چھوڑ کے جانے کو تیار۔کہاں کہاں گاما کی شکایت نہ لگائی۔ پولیس کے پاس گئے۔اعلیٰ حاکموں کے در کھٹکھٹائے۔لیکن کہیں بھی سنوائی نہ ہوئی۔الٹا شکایت کرنے والوں کو سزا بھگتنی پڑتی۔خوف سے کوئی سر نہیں اٹھاتا تھا۔۔۔

عمر چالیس بیالیس کو آئی تو شادی کرنے کا شوق چرایا۔اس کے سارے ہرکارے اچھی لڑکی کی تلاش میں نکل پڑے۔کئی بستیاں چھان ماری۔گھر کھنگالے۔لڑکیاں دیکھی۔لیکن کسی پر گاما کا دل نہیں بیٹھا۔ایک دن راہ چلتے شفق اور ربلورین کو دیکھا۔دونوں خوبصورت تھیں۔ شفق کا بھولا پن اور بلورین کا چنچلا پن من کو بھا گیا۔ایک موالی کو ان کی ماں راحیلہ باجی کے گھر بھیجا۔شفق اور بلورین نے کھری کھری سنائی۔راحیلہ باجی نے موالی کو دھتکار کر گھر سے نکالا۔اسی شام کو گاما نے ہلہ بول دیا۔شفق کو اٹھا کر لے گیا۔پوری بستی میں ہاہا کار مچی۔کوئی گاما کے پاس جانے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔پھر بڑی مشکل سے اس کی ذات کے کچھ لوگ تیار ہو گئے۔وہ بھی جیسے اپنے سر پر کفن باندھے نکلے تھے۔ڈرے سہمے پڑوسی گاما کے گھر پہنچے۔اس کے بھائیوں بھابیوں کے پیر پکڑ لئے۔لیکن وہ بھی گاما کے منہ نہیں لگنا چاہتے

تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد آخر مجبور ہوکر وہ بستی والوں کے ساتھ گاما کے پاس چلے گئے۔ گاما نے لڑکی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑنے کی بات تو مان لی۔لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ لی کہ وہ لوگ شفق کو اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار کریں۔لوگوں نے منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ مذہبی بھائی چارے کی دہائی دی لیکن وہ ایک بات بھی نہ مانا۔مرغے کی ایک ٹانگ،

''میں لڑکی کو ایسے ہی بنا کچھ کئے اس شرط پر چھوڑ رہا ہوں کہ یہ میری بیوی بنے۔ میں کسی اور کے لئے تھوڑی اس کو پوتر چھوڑ دوں گا۔ اس کو اگر لے جانا ہے تو یہ سوچ کے لے جاؤ کہ اس کو میری ہی بیوی بننا ہے۔''

بستی کے لوگ شفق کو لے کر آ تو گئے تھے لیکن کسی کو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ معاملہ کیسے سلجھائیں۔ جب راحیلہ باجی نے یہ سنا تو جیسے آسمان اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ اسے جب کوئی راستہ نہ سوجھا تو اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ دونوں بیٹیوں کو زہر دے کر وہ بھی خودکشی کر لے گی۔۔۔لیکن گاما نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔صبح ہی شادی کا سارا سامان لے کر گھر آ گیا۔ جس میں کپڑے، مہندی، کچھ سونے کے زیورات تھے۔اور شام تک شادی کی پوری تیاری کرنے کا آدیش دے دیا۔ساتھ ہی ساری بستی میں اعلان کر دیا۔

''اگر تم اپنی بہو بیٹیوں کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہو تو شفق کو میری دلہن بنانے میں مدد کرو۔ساری بستی کا کھانا آج میری طرف سے،اس لئے بے فکر ہوکر میری شادی میں شریک ہو جاؤ۔شادی کے لئے چاہے پنڈت کو بلاؤ یا مولوی کو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ویسے بھی میں دونوں کو نہیں مانتا ہوں۔بس یہ تم ذی عزت بستی والوں کے لئے کر رہا ہوں۔اپنی بہو بیٹیوں کو یہاں بلاؤ۔دلہن کو تیار کرو اور ہاں اپنی بیٹیوں سے کہہ دو میری دلہن کو سجانے

سنوارنے میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ابھی میں سدھرا نہیں ہوں ہاااں۔۔۔''

شفق دلہن بنی اپنی سہیلوں میں گھری تھی۔کوئی اسے ابٹن لگا رہی تھی تو کوئی مہندی ۔کوئی اس کے ماتھے کو چھوٹے جھومر سے سجا رہی تھی تو کوئی ہاتھوں میں چوڑیاں پہنا رہی تھیں ۔کچھ اس کے کپڑے پریس کر رہی تھیں ۔تو دو تین لڑکیاں اس کے بال بنا رہی تھیں ۔۔۔ حالانکہ گھر کے اندر باہر گہما گہمی تھی۔ لیکن کسی کے بھی چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ شفق کا چہرا اترا ہوا تھا۔اس کی کسی بھی سہیلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔شفق کی چھوٹی بہن بلورین غصے سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

اس شادی سے بس گاما اور اس کے دوست ہی خوش تھے اور ناچ بھی وہی لوگ تھے۔گاما کے گھر والوں میں بھی کوئی خوش نہیں لگ رہا تھا۔اور نہ وہ اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔۔۔ لیکن شادی کے بعد صرف پندرہ دن میں شفق مر گئی تھی۔

شفق اور بلورین جب کالج جانے لگیں تھیں تو راحیلہ باجی کے ساتھ ساتھ پوری بستی خوش تھی۔دونوں بہنیں پڑوسیوں کی چہیتی تھیں۔ شفق خوبصورت تھی لیکن سیدھی سادی اور شریف بھی بہت تھی۔پوری بستی میں اس کی اچھائیوں کا ذکر ہوتا تھا۔جبکہ بلورین بہت تیز اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔کسی کو بھی سامنے جواب دے دیتی تھی۔لیکن وہ پڑوس کی تمام عورتوں کے کام بھی آتی تھی۔کسی کو بازار سے کوئی ذاتی سامان لانا ہوتا تو اسی سے ہی منگواتی تھیں۔مائیں اپنی بیٹیوں کو مشکل اوقات میں انہی دو بہنوں کے پاس بھیجتی تھیں۔ تا کہ وہ انہیں سنبھال لیں۔ اور وہ دونوں بہنیں نرسوں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔

بلورین ناول، کہانیاں اور افسانوں کی دلدادہ تھی۔خاص کر وہ منٹو کی کہانیوں کی دیوانی تھی۔۔۔ اسے منٹو کے افسانوں کے کئی کردار اپنی ذات کا حصہ لگتے تھے۔ایسے کئے کردار تھے جو اسے اپنی نس نس میں اتارنے کا دل چاہتا تھا۔

شفق کی موت کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ بلورین کے لئے گاما کا پیغام آ گیا۔ اب تو پورا محلّہ ہی بپھر گیا تھا۔ گاما کی کومنٹی کے لوگوں کو بھی غصہ آ رہا تھا۔ لیکن سب ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ اور گاما بلورین کو لے گیا۔ بلورین مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔ وہ منٹو کے ایک ایک کردار کو یاد کر کے جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

''اری سنو تو ثمرہ۔ گاما تھا ہی سانڈ جیسا آدمی۔ اسی کی طرح وحشی بھی۔ پہلی رات کو میں اس سے ڈر جاتی۔ لیکن میں من بنا چکی تھی وہ ہارا ہوا ایشر سنگھ ہے اور میں بڑے دھڑلے والی کلونت کور۔''

''پھینک پتے۔۔۔ پتے پھینک۔۔۔ اور پھینک۔۔۔'' ایک رات گئی، دوسری، تیسری رات تک اس کی ساری اتر گئی تھی۔ اور چوتھی رات وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ شاید کسی حکیم وید سے مل کر آیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف صاف جھلکتا تھا۔ کئی داؤ آزمائے۔ کلونت کور کے سامنے اس کے سارے داؤ ٹوٹکے پھس ہو گئے۔ وہ بے حد ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ کلونت کور تیزی سے چیخی۔

''ایشر سائیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک'' کلونت کور نے اسے پرے پھینک دیا اور دھتکار کر بھگا دیا۔۔۔۔۔ تھووووو''

پانچویں صبح، ابھی بستی کی لڑکیوں کے ہونٹ سلے ہی تھے۔ ابھی لڑکوں کے دلوں میں گاما کا ڈر بیٹھا ہوا ہی تھا۔ ابھی بزرگ مرد عورتیں افسوس کے ساتھ ہاتھ ہی مل رہے تھے کہ شادی کی پانچویں صبح بستی میں اچانک بھنبھناہٹ سی پھیل گئی۔ سبھی لوگ ایک ایک کر کے گھروں سے باہر آ گئے۔ کچھ لوگ دوسری بستی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھ رہا تھا کیا ہوا۔ دوڑتے دوڑتے لوگوں کی بھیڑ گاما کے آنگن میں جمع ہو گئی، اب وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کیا ہو گیا، سب کو ایک ہی بات کا خدشہ تھا کہ اب وہ بلورین کی

لاش دیکھیں گے۔ پہلا دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا ہوا''اور دوسرا آنگن کے بڑے پیڑ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ جو بھی اس طرف دیکھتا تھا۔ ہکا بکا ہو کر رہ جاتا تھا۔ آناً فاناً بات چار سو پھیل گئی۔ بستی میں پولیس پہنچ گئی۔ پنچ سرپنچ سب جمع تھے۔ پولیس نے پیڑ سے گاما کی لٹکتی لاش اتار دی۔ پولیس کے لئے معاملہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھا، خودکشی کے سارے ثبوت صاف تھے۔ گاما نے پیڑ کی جس شاخ کو خودکشی کے لئے منتخب کیا تھا وہ شاخ اس چھپر کی عین سیدھ میں تھی جس کے نیچے جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا تھا۔ اسی چھپر پر چڑھ کر گاما نے رسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ چھپر کے پاس ہی اس کی چپل کا ایک پیر سیدھا اور ایک الٹا پڑا تھا۔ پولیس نے پنچوں اور سرپنچ کے دستخط، انگوٹھے لئے۔ اور فائل بند کر کے بغل میں دبا دی۔ لاش کے وارثوں کو بلایا گیا۔ کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا۔ کوئی موالی مشٹنڈا ابھی نہیں آیا۔ پولیس نے کچھ منت سماجت کر کے اور کچھ ڈرا دھمکا کر گاما کی لاش اس کے بھائیوں کے سپرد کر دی۔

کئی دنوں کی گہما گہمی کے بعد آج راحیلہ باجی کے گھر میں تھوڑی خاموشی تھی۔ بلورین کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ ماں نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ بلورین کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جب جاگی تو اس کی خاص سہیلی ثمرہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سرہانے رکھی کتاب ثمرہ نے اٹھا لی۔

کتاب وہیں کھل گئی جہاں کے ورق فولڈ کئے ہوئے تھے۔ کلونت کور

''سن ثمرہ۔۔۔ پانچویں رات گاما آیا ہی نہیں۔ مجھے فیصلے کا انتظار تھا۔۔۔ اور فیصلہ ہو بھی چکا تھا۔''بلورین کتاب کے اس پنے پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھیں جہاں کلونت کور تھی۔ ☆

گورکن

زندہ ون گاؤں کے بیچوں بیچ حیات ندی بہہ رہی تھی۔ندی کا پانی زندہ ون گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کے لئے آبِ حیات سے کچھ کم نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی جھرنوں کا شفاف اور جھلملاتا پانی بل کھاتا گاؤں میں پہنچ جاتا تھا اور یہاں اس چشمے کے پانی میں مل جاتا تھا جو گاؤں کے متبرک اور تیرتھ استھاپن ''ناگہ راد'' میں ابلتا تھا۔ جہاں سے حیات ندی جنم لیتی تھی۔''ناگہ راد'' تمام دھرموں اور مذاہب کا تیرتھ اور مقدس مقام تھا۔ یہاں ایک طرف شیو جی کا پرانا مندر اور دوسری جانب میاں احمدؒ صاحب کی زیارت گاہ تھی۔ بعد میں جدید طرز کا گوردوارہ بھی بنا گیا تھا۔۔۔چشمے کے شفاف پانی سے میاں احمدؒ صاحب کے مزار پر آنے والے زائرین وضو کرتے تھے اور مندر میں جانے والے یاتری اشنان۔۔۔ گاؤں کے سبھی لوگ خوشحال تھے۔ پریشان بس محمد رمضان تھا ۔۔۔

محمد رمضان زندہ ون گاؤں کا واحد گورکن ۔۔۔جس کے پاس نہ کھیتی تھی اور نہ کوئی دوسرا کام۔اُس کے گھر میں اُس کی بیوی کتج کے علاوہ ماں زون دید، دو چھوٹے بچے عبدال سلام اور سونی تھے۔گذارے کا انحصار گاؤں والوں کی مہربانی پر تھا۔مُردوں کو دفنانے کا کام محمد رمضان کے ذمہ تھا۔ جب کہ کوئی عورت مرجاتی تھی تو اُسے زون دید ہی نہلاتی تھی اور کفن پہناتی تھی ۔ پہلے پہل جب کوئی گاؤں میں مرجاتا تھا تو محمد رمضان کے گھر میں عید ہوتی تھی۔ پندراہ دن تک تعزیتی کھانا گھر میں آجاتا تھا۔ چوتھے پندرہویں اور چالیسویں پر تو وازہ وان سے بھری ترامی اُن کے ہاں پہنچ جاتی تھی۔سبھی گھر والے مزہ لے لے کر رستہ، گوشتابہ اور کباب کھاتے تھے۔جب ذیلدار کے گھر کا کوئی مرجاتا تھا تو اُس کی برسی پر وازہ وان کے

ساتھ ساتھ کچھ کپڑا،لٹھااور نقدی بھی آ جاتی تھی۔زون دیداور کنج کے پاس مری ہوئی عورتوں کے کئی جوڑے کپڑے پڑے تھے۔کبھی کوئی دیالوعورت مر جاتی تو اُس کی گِلٹ ،تانبے یا پیتل کے جھمکے اور چوڑیاں بھی مل جاتی تھیں۔وصیت کرتی تو اس کا قیمتی سوٹ اور چاندی کا چھلہ بھی مل جاتا تھا جبکہ مردوں اور بچوں کے کپڑے محمد رمضان اور عبدالسلام کے حصے میں آ جاتے تھے۔۔۔

لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔زندہ ون کے گلاب لوگ اڑوس پڑوس کے بوُل شہروں میں آنے جانے لگے۔جہاں کسی طرح ان کے گلشن ذہنوں میں کیکر کے بیج ڈالے گئے جو یہاں کی پھلواریوں میں آہستہ آہستہ جڑیں پھیلانے لگے تھے۔اب یہاں بھی لوگ اپنے ہی بارے میں سوچنے لگے تھے۔اقرباپروری بڑھ رہی تھی۔غریب پروری مفقود ہو رہی تھی۔ہاتھ پھیلانے والوں کو دھتکارا جارہا تھا۔نذرونیاز،خیرات پرطرح طرح کے فتوے لگ رہے تھے۔''ناگہ راد'' جیسی متبرک جگہ پر قبضے کی سوچ بڑھنے لگی تھی۔اب اگر کوئی مر بھی جاتا تھا تو لوگ زیادہ دنوں تک یادنہیں رکھتے تھے۔محمد رمضان کا حال دن بدن بُرا ہو رہا تھا۔مردے کو دفنانے کے بعد اس کے ہاتھ پر سو دوسو روپے رکھ کر ٹرخایا جاتا تھا۔چوتھے اور چالیسویں پر کھانا آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ایسے میں اب محمد رمضان کو خود ہی برتن لے کر لوگوں کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا۔جہاں سے اکثر وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا تھا۔ایسے وقت پر زون دیداور کنج کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے آنسوں آجاتے تھے اور بچوں کے چہروں پر یاس اور نا امیدی کا سوکھا پن جم جاتا تھا۔۔۔

کئی دنوں سے سونی بیمار تھی۔بخار سے برا حال تھا۔محمد رمضان نے حکیم صاحب کے گھر کے گرد کئی چکر کاٹے مگر خالی ہاتھ ہونے کے سبب اندر جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔پچھلی سردیوں میں جب زون دید کو کھانسی ہو گئی تھی تو اس کی دوائی کے پیسے ابھی تک

حکیم صاحب کو نہیں دیئے تھے۔ کتج نے میاں احمد صاحب کے آستانے سے مٹی لائی تھی جس کا لیپ سونی کے ماتھے پر سوکھ بھی چکا تھا۔مگر سونی کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا ۔آنکھ بچا کر شیو جی کے مندر سے دھول بھی اٹھا لائی تھی پر کوئی افاقہ نہ ہوا اور یوں بنا علاج کے ایک دن سونی بخار کے ہتھے چڑھ ہی گئی۔۔۔۔۔۔۔۔

سونی کی موت نے جیسے زون دید کی کمر توڑ کے رکھ دی ۔ کتج گم سم رہنے لگی تھی ۔عبدل سلام ڈرا ڈرا اور سہا سہا لگ رہا تھا۔محمد رمضان بے چین اور پریشان تھا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور شام کو دیر سے لوٹتا تھا۔ زون دید خاموش لیکن مایوس نگاہوں سے بیٹے کو تکتی رہتی تھی۔آخر ایک شام کچھ زیادہ ہی دیر سے گھر آ کر محمد رمضانہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ماں میں یہ گاؤں چھوڑ کر شہر جا رہا ہوں ۔ وہاں کوئی کام کروں گا ۔ مزدوری کر کے کچھ کما لوں گا۔ یہ اپنی بے سروسامانی اور تم لوگوں کی فاقہ کشی اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ۔عبدل سلام دن بدن کمزور ہورہا ہے کہیں سونی کی طرح ۔۔۔''

اس کے آگے محمد رمضان کچھ کہہ نہ سکا۔اس کی ہچکی بندھ گئی۔کتج نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ بھی شوہر کے ساتھ شہر جانا چاہتی تھی۔شہر میں کچھ کام کر کے اپنے میاں کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔زون دید کی خشک آنکھیں تر ہوگئیں۔۔۔

محمد رمضان تیاریوں میں جُٹ گیا تو زون دید زیادہ پریشان ہوگئی۔ وہ محمد رمضان کی منت سماجت کرنے لگی۔گھر چھوڑ کر نہ جانے کے لئے ہاتھ جوڑنے لگی۔مگر محمد رمضان کے سامنے گھر کی افلاس کسی اژدر کی طرح پھن پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ زون دید کے پاؤں پڑا۔اُس کے ہاتھ چومے۔ وہ ماں کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا۔لیکن زون دید نے اس کی ایک نہ مانی۔۔آج شام کے دھندلکے میں جب محمد رمضان اپنی بیوی اور بچے کو لیکر جانے لگا تو اچانک ۔۔۔زون دید کی خشک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں گرنے لگے۔ان آنکھوں کا

پانی حیات ندی کے آبِ حیات سے بھی زیادہ متبرک، شفاف اور پاکیزہ تھا۔ اس نے نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جب اس کی نگاہیں لوٹ کر آ گئیں تو محمد رمضان اور کتج نے اس کی آنکھوں میں شعلے دیکھے، تپش دیکھی، نفرت سے بھرا جوش و جلال دیکھا۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھی۔۔۔۔۔قبر کھودنے والا پھاوڑا اُٹھایا اور قبرستان کی طرف بڑھنے لگی۔ محمد رمضان اور کتج بھی اس کے پیچھے پیچھے حیران و پریشان قبرستان پہنچے۔۔۔زون دید قبرستان کے بیچوں بیچ حنظل کے پیڑ کے قریب کھڑی ہوگئی۔۔۔محمد رمضان نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں تو اسے لگا پورا ''ناگ راد'' اندھیرے میں ڈوب رہا ہے۔ ماحول میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہو رہی ہے۔ اچانک بجلیاں کڑکنے لگیں، زور زور سے آندھیاں چلنے لگیں اور کچھ ہی پل میں بوندا باندی شروع ہوگئی۔۔۔زون دید نے ایک نظر اپنے بیٹے محمد رمضان پر ڈالی، پھر آسمان کی طرف دیکھا۔۔۔پھاوڑا اٹھا کر سر سے بلند کیا اور پوری طاقت کے ساتھ حنظل کے درخت کے تنے پر دے مارا۔ پھاوڑے کا تیز دھار والا پھل درخت کے سینے میں اندر تک گھس گیا۔۔۔پھر جیسے ''ناگ راد'' میں چھپے بیٹھے سارے حشرات الارض جاگ گئے ہوں۔ جیسے میاں احمؒ صاحب کے مزار کی ساری چادریں ہوا میں اُڑنے لگی ہوں۔ روحیں آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہوں۔ جیسے شیو جی کے مندر کی ساری گھنٹیاں ایک ساتھ بج اُٹھی ہوں۔ ترشول آسمان کو چھید رہے ہوں۔۔۔۔۔محمد رمضان ماں کی طرف دوڑنے لگا۔۔۔۔وہ چلا رہا تھا۔۔۔

''نہیں ماں نہیں۔۔۔ایسا مت کرو مااااں'' محمد رمضان دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ زون دید ہاتھ اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر کی چادر ہوا میں اُڑ گئی تھی۔ اُلجھے سفید بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔۔۔اب بارش تیز ہوگئی تھی۔ محمد رمضان بڑی مشکل سے زون دید کو گود میں اٹھا کر گھر لایا۔ کتج اور عبدالسلام بھی اندر آ گئے۔ وہ سارے

بھیگ چکے تھے۔محمد رمضان نے زون دید کوایک پھٹی چادر پر لٹا دیا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی، اس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہورہا تھا۔محمد رمضان نے ماں کا سر اپنی گود میں لے لیااور اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں پھرنے لگا۔ کتج ساس کے پیر سہلا رہی تھی تو عبدل سلام نے دادی کا ہاتھ اپنے ننھے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔۔۔۔آہستہ آہستہ زون دید کی اُترتی چڑھتی سانسوں میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔اس نے آنکھیں کھولیں۔حسرت سے بیٹے کو دیکھا پھر بہواور پوتے کو دیکھا۔ یاس اورناامیدی اس کے چہرے کومرجھا چکی تھی ۔اُس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔۔۔ بادلوں کی گھن گرج میں کتج کی چیخیں دب کررہ گئیں۔۔۔

زون دید کی موت کوئی بڑا حادثہ یا کوئی تاریخی واقعہ نہ تھا، جو وہ حالات بدلنے کا سبب بنتی۔شاید حالات کو بدلنا ہوتا ہے۔اور ایسے کئی واقعات ایک ساتھ مل جاتے ہیں، جو تاریخ رقم کردیتے ہیں۔یا کبھی ایسے حالات بنائے جاتے ہیں جس سے پوری انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔یہ انسان ہی تو ہے جس نے ماحول میں تعصب کا زہر گھول دیا ہے۔انسان کوانسان کے خلاف اکسانے کا ایسا نشہ اگایا ہے جس کا اثر صدیوں تک زائل ہونے کے آثار ہی نہیں لگ رہے ہیں۔پھراس زہریلی ہوا سے زندہ ون کی صاف وشفاف فضا کیسے بچ پاتی۔۔۔

یہاں کے برف سے ڈھکے پہاڑ جیسے اچانک آتش فشان بن گئے۔''ناگ راد' کے سُوتے نفرت اور تعصب کے فوارے اُبلنے لگے۔حیات ندی کا شفاف پانی سرخ ہوگیا۔ زندہ ون جیسے مرگ ون میں بدل گیا۔مرغزار قبرستان بن گئے۔روز ایک دوتین یہاں تک کہ کبھی کبھی دس بارہ لوگ مرنے لگے۔۔۔سرسبز اور شاداب 'ناگہ راد' تیزی کے ساتھ کیکروں کا جنگل بن رہا تھا۔

محمد رمضان کے گھر پراب بھیڑ لگی رہتی ہے۔ دن تو دن رات کو بھی اس کے

دروازے پر مرنے والوں کے رشتہ دار اور احباب منت سماجت کرتے رہتے ہیں۔وہ قبریں کھود کر رکھنے لگا۔اور اپنی مرضی کی قیمت بھی وصول کر رہا ہے۔اب وہ کسی کے چوتھے چالیسویں یا برسی پر کسی کے گھر نہیں جاتا ہے۔نہ کھانا لانے والوں کو گھر آنے دیتا ہے۔اس کے گھر میں ہر روز اچھے اچھے پکوان بنتے ہیں۔کنج اور عبدالسلام کے لئے کپڑے بازار سے آتے ہیں۔۔۔

گھر میں عیش وآرام کی ساری چیزیں تو آ گئیں لیکن زون دید اور سونی کی کسمپرسی والی موت یہ لوگ نہیں بھول پا رہے ہیں۔شاید اسی وجہ سے حنظل کے پیڑ سے پھاوڑا نکالنے کی طرف ان کا ظن نہیں جا رہا ہے۔جو ابھی بھی کسی مقدس نشانی کی طرح لٹک رہا ہے اور حنظل کی پیٹھ سے گاڑھا گاڑھا سبز مواد رِس رہا ہے۔۔۔

☆☆☆

کُن فیکون

میری فریاد رنگ لائی اور دو فرشتے میرے پاس بھیج دیئے گئے ۔ مجھے مریخ سے اُٹھایا گیا۔ یہ مریخ کے ریتلے میدانوں میں انسان کا نیا کارنامہ تھا۔صرف ایک ہزار سال پہلے جب ہم مریخ پر رہنے آیئے تھے تو یہاں پتھریلی زمین اور ریتیلے میدانوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پانی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ہم نے پتھریلے حصے میں آگ پیدا کر لی۔آگ سے بھاپ اور بھاپ سے پانی بنالیا۔ پھر ریتیلے میدان میں مصنوعی بارش سے سبزہ اُگ آیا۔ یہ کام ہم پانچ ہزار سال پہلے ہی چاند اور دوسرے کئی سیاروں پر کر چکے تھے۔تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جب پانچ ہزار سال پہلے زمیں انسان کے لئے کم پڑ گئی اور ہماری وجہ سے رہنے کے قابل بھی نہ رہی تو ہم نے چاند ستاروں پر کمندیں ڈال دی تھیں۔ان کو بھی آلودہ کر کے تب مریخ ہمارا مسکن بن چکا تھا۔ یہاں بھی اب ہم ایک ہزار سال سے رہ رہے ہیں لیکن اب لگ رہا ہے کہ مریخ کے بعد ہمیں کسی نئی کہکشان کی کھوج میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔ جب زمین کے اندر چھید پر چھید کر کے ہم نے ہزاروں میلوں کی مسافت کو کم کر دیا، جس سے براعظموں کی دوریاں مٹ گیں۔ ہم نے بحرِ الکاہل کے سمندر کو ہمالیہ کے سبھی سرسبز اور خشک پہاڑوں سے بھر دیا، انٹارکٹکا کے یخ بستہ پانی سے افریقہ کے ریگستان نخلستان میں بدل دیئے تو یہ انسانی ترقی کی معراج تھی۔ زمین کے بعد چاند، خلاء، اڑوس پڑوس کے سیاروں کو ہم نے اپنا مسکن بنایا۔ کہکشان کو سیڑیوں کی طرح استعمال کیا اور مریخ تک جا پہنچے۔۔۔

دو فرشتے مجھے مریخ کی مخملی گھاس سے اٹھا کر دودھیا بادلوں میں غوطہ دینے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا تن اُجلے بادلوں کی طرح شفاف اور سفید دکھنے لگا۔ میں اپنے آپ کو

ہلکا ہلکا سا محسوس کرر ہا تھا۔ پھراوپر جا کر ہم آسمان کی نیل گوں وسعتوں میں کھو گئے۔آ گے جا کر کہیں روشنی کے رنگین ہالے جھلمل جھلمل کرتے میرے وجود کو روشن کر گئے تب میں خود کو دیکھ پایا۔ پھرنورانی کرنیں ہماری سیڑیاں بنی اوراب جس مقام یا منزل پر ہم پہنچ گئے تھے اس کی تعریف یا تخصیص کرنے میں میری زبان گنگ تھی۔۔۔ بس ایک خوشگوار سکوت تھا۔روشنیوں کا فرش تھا۔روشنیوں کے دبیز پردے تھے اور سامنے سنہری ملکیشی روشنی میں ہلکی نیلاہٹ کے ساتھ ساتھ قوسِ قزاح جیسے رنگ چھن چھن کر برس رہے تھے۔جن کی طرف دیکھنا صرف محال ہی نہیں ناممکن لگ رہا تھا۔ میں نے ہزار بار دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار میری نظریں ان نورانی کرنوں سے چندھیاں گئیں تھیں۔ یہاں فرشتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کچھ کھڑے تسبیہ میں مشغول تھے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ ہر طرف پرُسکوں اور راحت بخش ماحول تھا۔جس میں میں بذاتِ خود موجود تھا اور سوچ بھی رہا تھا۔ سامنے نورانی روشنی سے ایک آواز آئی جو میری سماعت کو بہت خوشگوار لگی۔

''اے آدم یہ تیری فریاد کیسی ہے۔؟ ایسی فریاد تو اب عنقا ہے۔تم تو اب دعا کرنا بھی بھول چکے ہو۔ پھر تیری یہ فریاد کیسی؟ جونہی تمہاری یہ فریاد ہم تک پہنچی۔ہم نے اسی وقت تم کو طلب کیا ہے۔اب بتاؤ کیا تم ہمارے قریب آ کر بھی ایسی ہی خواہش رکھتے ہو یا تم نے اب اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔؟''

''نہیں میرے مولا۔ میرے ارادے میں کوئی تغیر، کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے۔ میری اب بھی یہی فریاد ہے۔''

''تم نے تو کب سے میری حکمِ عدولی شروع کی ہے۔اپنی حکمت اور اپنی شریعت نافذ کردی ہے۔ساری کائنات کو اپنی میراث سمجھنے لگے ہو۔اپنی تحقیق اور ترسیل پر نازاں ہو۔ اپنی نئی نئی تحقیقات کے لئے کوشاں ہو۔ساری کائنات کو تسخیر کرنے کی دُھن میں میرے ساتھ

ساتھ خود کو بھی بھول چکے ہو۔۔۔اور آج تیرے لبوں پر یہ کیسی حیران کن فریاد ہے۔؟''

''میرے مولا۔۔۔میں، ہم انسانوں کے لڑائی جھگڑے اور مرنے مارنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ مذہبی تعصب، فرقہ پرستی، سماجی نابراری اونچ نیچ کی غیر محذبانہ لڑ ئیاں اُن سے بھی پریشان نہیں ہوں۔ یہ تو ہر دور میں ہوتا آ رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں برسوں سے ایک انسان دوسرے انسان پر اپنی برتری دکھا رہا ہے۔اپنے ظلم سے دوسرے کو دبا رہا ہے۔ہم نے سائنس اور تحقیق میں عروج پایا۔ زمین کی تہہ تک پہنچ گئے اور آسمانوں کو کھنگالا۔ موت کو بس میں کر لیا اور زندگی کو امر بنایا۔ اس بھاگ دوڑ میں زمین کم پڑ گئی تو ہم چاند پر پہنچ گئے۔ چاند چھوٹا پڑ گیا تو ہم نے کہکشاں کو پیروں تلے روندا۔ ہم نے چاند تاروں، مریخ یہاں تک کہ سورج کی طرف بھی قدم بڑھائے۔ مجھے ان چیزوں کی بھی پروانہیں ہے۔ میں تو بس ایک بات کے لئے پریشان ہوں۔ آپ نے جو اپنی اس کائنات کو ایک جہت دی تھی۔ ایک محور دیا تھا۔ جس کے گرد تیرا یہ سارا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہم نے اسے آلودہ بنا دیا۔ اس کا توازن بگاڑ دیا۔ یہاں کی کوئی بھی چیز اب اپنے راستے پر نہیں چل رہی ہے۔ سب الٹا پڑ رہا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے آپ کی دی ہوئی زمین کو خراب کر دیا۔ پھر چاند، پھر تارے اب مریخ۔ تمہاری ساری کائنات کا حقیقی توازن بگڑ رہا ہے۔ اسے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ سب بھیانک ہیں۔ خوفناک ہیں۔ اب ہم مر نہیں رہے ہیں، انسان ہزاروں سال تک جی رہا ہے۔ ہمارے اعضاء کٹ رہے ہیں تو ہم منٹوں میں پیوند کاری کر کے نئے اعضاء بنا لیتے ہیں۔ بیماریاں اور طاعون ہم سے ڈر کے کہیں اندھیرے غاروں میں چھپ گئے ہیں۔ کوئی مریخ پر گھر بنا رہا ہے تو کوئی چاند پر، کوئی خلاء میں چھپ رہا ہے تو کوئی سمندر میں۔ لیکن ہم جیئے جا رہے ہیں۔ اب ہم اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ تمہاری ساری کائنات چھوٹی پڑ رہی ہے۔ سورج، قمر اور تارے اپنا محور بدل رہے ہیں۔ سمندروں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔

آسمان سمندروں سے زیادہ پانی برسا رہا ہے۔ زمین اب اناج کے بدلے سونا چاندی اور ہیرے اگل رہی ہے۔''

''بس بس اب تیرا بہت سن لیا ہے۔تم کیا سمجھتے ہو جو کچھ تم میری کائنات میں کر رہے ہو میں اس سے غافل ہوں۔ غافل تو تم لوگ ہو۔ میں دیکھ بھی رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں۔ اب تم مختصراً بتادو تم کیا چاہتے ہو۔''

''میرے مولا میں تو اتنا سمجھ گیا ہوں کہ گردشِ شام وسحر یوں ہی نہیں پسِ پردہ تو کوئی ذات لگی بس وہ ذاتِ واحد، وہ حقِ معبود اپنی کائنات کو پھر سے اپنی ڈگر پر لائے۔ یہ پھر سے اپنے محور پر گھومتی رہے اس کا بگڑا توزن پھر سے بحال ہو جائے۔عمر جاویداں جیسا غیر فطری نظام ختم ہو جائے اور انسان پہلے کی طرح ہی مرتا رہے۔''

مجھے اپنے اردگرد لطیف سے تبسم کا احساس ہو رہا ہے۔ جیسے میرے مولا نے میری بات پر ہلکا سا مسکرا دیا ہو۔میرے انگ انگ میں مسرت اور جوش بھر گیا۔میں نے جذبات میں آکر کہہ دیا۔

''میرے مولا اب آپ نئے سرے سے ہی کُن کہہ دیجئے۔۔۔''

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔میں نے محسوس کیا میرے اردگرد آتے جاتے اور تسبیح میں مشغول سارے فرشتے رک گئے ہیں۔میرے ساتھ کھڑے دونوں فرشتے حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔جیسے قوسِ قزاح کے رنگ بکھرا گئے ہوں۔نورانی فرش ہل رہا ہو۔روشنیاں سارے ماحول کو چکا چوند کر رہی ہیں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے مولا نے ''کن'' کہہ دیا ہو اور '' فیکون'' کا عمل جاری ہو گیا۔میں تحلیل ہو رہا ہوں۔لیکن تحلیل ہوتے ہوتے مجھے اپنی فریاد پر افسوس ہو رہا تھا۔کیا پتا اس کن فیکون کے بعد اب جو نئی کائنات وجود میں آئے گی اس میں آدم کا ظہور ہو گا بھی کہ نہیں۔۔۔۔ اب جیسی بھی تھی یہ کائنات

میری تھی اور میں اس کا واحد وارث تھا۔

☆☆☆

تاجو قصائی

پچھلی ٹانگوں کو باندھ کر رسی کی گانٹھ اگلی ٹانگ میں پھسادی، اس کا دوسرا بل دوسری ٹانگ کے گرد لپیٹ کر رسی پچھلی ٹانگوں کی بیچ سے گذار کر جو اسے کس کے کھینچی، تو ٹانگیں سکڑ گئیں ۔۔گرن نیچے کی طرف جھکنے لگی ۔۔۔رسی کو اور کھینچا تو گھٹنے ٹیک دیئے ۔۔۔پھر ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ بھینسا چت ۔۔۔تاجو نے جلدی جلدی رسی کو ایک ہاتھ میں لیکر دُم ٹانگوں میں پھنسا کے اپنے گھٹنے بھینسے کی پیٹھ پر دبا دیئے۔جب تک جبار قصائی نے گردن موڑ کر نرخرا کاٹ دیا۔۔۔ برررررکر کے خون کا پھوارہ نکلا۔یہ وقت ہوتا ہے جب گردن کٹے بھینسے میں دس ہارس پاور سے بھی زیادہ طاقت آجاتی ہے۔اور کھینچ کر بھاگنے کی کوشش میں پکڑنے والے کو گھسیٹ کر مار بھی سکتا ہے۔تاجو ایک مشاق قصابن کی طرح رسی کھینچ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پاؤں بھینسے کی پشت پر دبا دیئے۔جبار قصائی نے چھری نرخرے کے اندر ڈال دی، کوئی اور نس کٹ گئی ۔خون کا ایک ہلکا سا پھکا نکلا، بھینسے نے آخری جھرجھری لی ۔۔۔ اور تاجو نے آہستہ آہستہ رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔۔۔

تاجو جبار قصائی کی بیٹی تھی ۔ ہرنی جیسی پھرتی اور ناک نقشے کی تیکھی ۔باپ کے کام میں مجبوراً ہاتھ بٹاتی تھی ۔اصل میں وہ اس کام سے ہی متنفر تھی ۔نہ ہی قصائی کام پسند اور نہ ہی کسی قصائی سے شادی کرنے کی متمنی ۔وہ کسی خیالی شہزادے کی چاہ میں بھی آہیں بھرنے کی قائل نہیں تھی ۔بس ایک ایسا شوہر چاہتی تھی جو اسے پیار کرے، اس کا خیال رکھے۔چاہے وہ مزدور یا ٹھیلہ والا ہی کیوں نہ ہو۔ پر ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔قصائی کی بیٹی قصائی کے گھر نہ بیاہی جاتی، تو کیا راجہ کے گھر کی رانی بنتی ۔تاجو کی شادی بھی آخر قصائی کے گھر ہی ہوگئی۔گھر بڑا تھا،

پر گھر کے مکیں بڑی کس مپرسی کی زندگی کاٹ رہے تھے۔اس کا شوہر کریم قصائی دکھنے میں ہی کمزور اور کام کاج میں سست تھا۔اب تاجو سمجھ گئی تھی کہ اسے اس گھر میں بیاہ کر کیوں لایا گیا تھا۔تاجو کو کریم قصائی کی بیوی بنا کر اس کے لئے کماؤ نوکرانی لائی گئی تھی۔اب یہاں آ کر تاجو کو بھینسے گرانے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار ان کو حلال بھی کرنا پڑتا تھا۔

گاؤ کشی کا معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔شہر کا شہر قصاب برادری کا دشمن ہو گیا تھا۔ان کے خلاف زہر اگلا جا رہا تھا۔شاطر ذہنوں میں ان پر حملہ کرنے کی سوچ بھی پل رہی تھی۔لیکن قصاب برادری کا جو ڈر اور خوف عام لوگوں کے دلوں پر ویسے بھی چھایا رہتا ہے۔وہی خوف حملہ آواروں کو بھی حملہ کرنے سے روک رہا تھا۔ پھر بھی اکادُکا حملے ہو رہے تھے۔پر وہ ان ہی لوگوں پر ہوتے تھے جن کی دکانیں اپنے محلے سے دور دوسری جگہوں پر تھیں۔پہلے پہل یہ حملے قصابوں کے لئے اتنے تشویش ناک نہیں تھے،لیکن ایک دن جب شہر کے بھرے بازار میں کریم قصائی پر حملہ ہوا اور اسے بڑی بے دردی کے ساتھ مار ڈالا گیا تو پوری برادری میں تشویش پھیل گئی۔پوری برادری ہاتھوں میں چھریاں لیکر سڑکوں پر آ گئی۔کریم قصائی کی لاش کندھوں پر اٹھا کر شہر کی گلی کوچوں میں گھوماتے رہے۔لوگ ان کے ہاتھوں میں چھریاں اور آنکھوں میں اتر آئے خون کو دیکھ کر بہت زیادہ ڈر گئے تھے۔بچے،عورتیں خوف کے مارے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئیں تھیں۔۔۔حکومت حرکت میں آ گئی۔قصائی برادری پر جم کر لاٹھی چارج ہوا، ان پر ٹیر گیس کے گولے دھاگے گئے۔۔ دھنگے میں دو پولیس والے زخمی کیا ہو گئے۔پوری کی پوری سرکار حرکت میں آ گئی۔پولیس نے گولی چلائی۔تین اور جواں لڑکے مارے گئے۔جب وہ خون میں لت پت اپنے بچوں کی لاشیں اٹھانے لگے،تو پولیس کا بھرپور حملہ ہوا۔کئی لوگ زخمی ہوئے۔بہت سارے گرفتار کر لئے گئے۔محلوں اور علاقوں میں بنا ڈھیل دیئے کرفیو لگا دیا گیا۔ان کے خلاف سخت قانوں جاری کئے گئے۔کوئی قصائی گائے،

بیل، بھینس نہیں مارے گا۔ کسی سڑک کے قریب گوشت کی دکان نہیں ہونی چاہئے۔ وہ اپنے گھروں میں صرف چھوٹے جانور یعنی بکرا یا بھیڑ ہی حلال کر سکتے ہیں، اپنے گھروں میں ایک چھری سے زیادہ ''ہتھیار'' نہیں رکھ سکتے ہیں۔

جبار قصائی اب بوڑھا ہو رہا تھا لیکن اسے اپنی لاڈلی بیٹی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو دوسری جگہ نئے گھر بنا کر دیئے۔ پرانا گھر بیٹی کو دیا اور گلی کی طرف ایک چھوٹی سی دکان بھی بنا کر دے دی۔ اس کے دونوں بچوں کو پاس والے اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ اور خود جب تک زندہ رہا۔ بیٹی کے ساتھ ہی رہا۔۔۔

تاجو کا بیٹا احمد پڑھ لکھ کر اسکول ٹیچر ہو گیا تھا، اور بیٹی سلمیٰ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ تاجو کی گلی والی دکان اچھی خاصی چل رہی تھی۔ جس میں کھوپریل رسی سے لٹکتے کیلے۔ سیب اور سنتروں کے ڈبے۔ کئی قسم کی سبزیوں کے علاوہ ضروریات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ دکان میں بچوں کے لئے رکھی ٹافیاں اور بسکٹ بھی خوب چلتے تھے۔ آج کل شہر کے حالات پھر بگڑے ہوئے تھے۔ کرفیو کی مدت اور پولیس کی گشت بڑھا دی گئی تھی۔ دوردی پوش کبھی کبھار گلی کے بھی چکر لگاتے تھے اور تاجو کی چھوٹی دکان سے سگریٹ، بسکٹ وغیرہ لے جاتے تھے۔ کبھی کبھار دو چار گالیاں دے کر اس کی دکان بند کرا دیتے تھے اور کبھی اسے خود بلا کر دکان کھلواتے تھے اور اپنے مطلب کی چیزیں لے جاتے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ اور دو چار دنوں سے کچھ زیادہ ہی سردی پڑ رہی تھی۔ کل سے احمد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام تک اس کا بخار بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔

''نہیں ماں باہر کرفیو لگا ہے۔ اور رات کا وقت ہے۔ ہم اسپتال نہیں جا سکتے ہیں۔''

''ارے بیٹا تم چلو میرے ساتھ۔ ابھی رات تھوڑی نا ہو گئی ہے۔ شام کا ہی تو وقت

ہے۔''

ماں کیسی باتیں کر رہی ہو۔قانون سب کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے''

احمد پتر یہ کون سا قانوں ہے۔جو بیمار آدمی کو اسپتال جانے سے روک دے''

لمبی بحث کے بعد بیٹی سلمٰی کو اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر کے دونوں ماں بیٹے اسپتال جانے کے لئے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد سلمٰی کتاب کھول کر بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔۔وہ یہی سمجھی شاید ماں اور بھائی واپس آ گئے ہیں یا کوئی پڑوسی کسی چیز کے لئے آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر اندھیرے میں کوئی کھڑا تھا۔

''کون ہے۔دکان بند ہے''سلمٰی نے جلدی سے کہا

''کیوں بند ہے''اندھیرے سے آواز آئی

''کرفیو ہے۔بھائی اور امی بھی گھر میں نہیں ہیں''

''کہاں گئے ہیں۔بازار میں بم پھینکنے یا کہیں آگ لگانے''

''بھائی بیمار ہے،امی اس کو لے کر اسپتال گئی ہے''سلمٰی نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

''مطلب۔گھر میں تیرے سوا کوئی اور نہیں ہے''

''جی ۔۔۔ جی ہاں'' سلما نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔آدمی نے کوئی چیز کندھے سے اتار کر دکان کے تھڑے کے ساتھ رکھ دی اور چہرے پر مفلر لپیٹ کر آگے بڑھ گیا۔

''چل اندر'' آدمی نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی ۔۔وہ گھر میں ۔۔۔''سلمٰی نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش

کی۔لیکن مفلر پوش نے دروازے میں اپنا پیر اُڑس دیا۔

''چل نا اندر'' مفلر پوش نے سلمٰی کو اندر کی طرف دکہ دیا۔۔خود بھی اندر گیا اور پیر کی ٹھوکر سے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔سلمٰی ڈری سہمی بھاگ کر کمرے کی دوسری دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور ساتھ میں روئی بھی جا رہی تھی۔ مفلر پوش تیزی کے ساتھ سلمٰی کی طرف بڑھ گیا۔سلمٰی دوسرے کونے کی طرف بھاگی۔ مفلر پوش نے جست لگائی اور سلمٰی کو بازوؤں کے حلقے میں دبوچ لیا۔ وہ رو رہی تھی، چلا رہی تھی، پر مفلر پوش بہت جلدی میں لگ رہا تھا۔سلمٰی کے چہرے پر دو تھپڑ مار کر اس کے بدن سے کپڑے کھرچنے شروع کر دیئے۔سلمٰی نے پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ مفلر پوش کو غصہ آ گیا۔اس نے سلمٰی کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا اور خود اس کے اوپر آ گیا۔۔۔

دروازہ دھڑام سے کھل گیا۔لیکن مفلر پوش کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کون آیا اور کون گیا۔اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔۔۔کھوپریل رسی کا پھندا اس کی ٹانگ میں پھنسا۔اور ایک لمحے میں رسی کی دوسری گانٹھ اس کی دوسری ٹانگ میں پھنس گئی۔ اسے کھینچ کر کمرے کے بیچ تک گھسیٹا گیا۔۔۔ جب کھپریل رسی کی چبھن اس نے اپنی کلائیوں پر محسوس کی، تو اس کے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آ گئے۔ ابھی وہ حالات کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ تاجو نے ایک ہاتھ سے اس کا مفلر اُتارا۔۔گردن موڑ دی اور چھری نرخرے پر رکھ دی۔۔۔۔

''نہیں ماں نہیں'' اچانک کمرے میں احمد کی تیز آواز گونجی۔

☆☆☆

سبیل

''چل میرے گھوڑے ٹک ٹک ٹک۔امی را کا کو باہر لے چلونا۔مجھے اس کی سواری کرنی ہے'' چھوٹا عامر طبیلے میں بندھے گھوڑے پر بیٹھا اپنی ماں سارہ سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔

''نہیں عامر بیٹا ابھی کیسے باہر جا سکتے ہیں۔باہر تو سارا بند پڑا ہے۔'' گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال رہی سارہ نے بڑے پیار سے عامر کو گھوڑے سے اتارتے ہوئے کہا۔یہ تھوڑی ہی گھاس بچی تھی جو وہ آخری بار گھوڑے کو کھلا رہی تھی اس کے بعد ان کے پاس ایک تنکا بھی نہیں بچا تھا جو وہ آج شام گھوڑے کو کھلا دیتے۔

سرتاج کے دل میں مایوسی اور آنکھوں میں اداسیاں ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔وہ اپنی ماں، اپنی بیوی سارہ اور بچوں سے آنکھیں چرا رہا تھا۔غربت کی منحوس دیوی اس کے گھر ڈیرہ ڈال چکی تھی۔وہ ڈر کر بھاگ گیا ہوتا اگر اسے یہ احساس کچو کے نہ لگاتا کہ وہ سارے پریوار کا واحد کفیل ہے۔

''کچھ کرو سرتاج۔بچے بھوکے ہیں؟'' سارہ نے اس کے تناؤ بھرے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا تو سرتاج اور زیادہ گھبرا گیا۔

یہ کرفیو کا کالا دیواب کی بار شہروں کو چھوڑ کر قصبوں اور گاؤں کی ہر ڈگر، ہر پگڈنڈی اور کھیت کھلیانوں کو اپنے خونی پنجوں میں دبوچ چکا تھا۔کھلے آنگن، دھول بھری گلیاں۔کیچڑ سے لت پت ارور مرور اور آبڑ کھابڑ راستے سب بند ہو چکے تھے۔یہ کرفیو کا دوسرا مہینہ جاری تھا۔ان دو مہینوں میں جلسے جلوس جاری تھے۔کہیں کہیں پر جھڑپیں۔شیلنگ اور فائرنگ بھی

ہوتی رہتی تھی ۔سیب، اخروٹ، بید اور سفیدوں کے بڑے بڑے باغات میں جہاں کبھی شگوفے پھوٹتے اور سبزہ اگتا تھا اب وہاں خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ ہر دن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مارا جاتا تھا۔مرنے والوں کی تعداد سو کے قریب اور زخمیوں کی تعداد ہزاروں ہوگئی تھی۔ ہڑتال کی وجہ سے بازار بند۔ٹریفک بند۔فون اور انٹرنیٹ بند۔غرض زندگی جینے کے سارے وسیلے عنقا۔ بھوک و افلاس دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔کئی گھروں میں کنستر خالی ہو چکے تھے۔آس پڑوس کی محلّہ کمیٹیاں جو ریلیف کے نام پر خیرات بانٹ رہی تھیں۔ وہ بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ چکی تھیں۔سودا سلف لانا مشکل ہو رہا تھا۔رات دیر گئے کسی کوچے میں چوری چھپے کوئی جنرل اسٹور کھل بھی جاتا تھا تو وہاں بھیڑ اتنی زیادہ ہو جاتی تھی کہ دکاندار کو اپنے گھر والے بھی مدد کے لئے رکھنے پڑتے تھے۔کوئی پیسے لے رہا ہے تو کوئی راشن دے رہا ہے۔کئی لوگ تو پیسے دے کر بھی آدھا آدھا گھنٹہ انتظار میں کھڑا رہتے تھے۔سرتاج کئی دفعہ دکان کے نزدیک گیا لیکن اس جمگھٹے میں اتنے لوگوں کے سامنے دکاندار سے سودا سلف مانگنے کی ہمت ہی مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔سوچ رہا تھا کہ سب کے سامنے کیسے دکاندار سے ادھار مانگے گا۔اس کی ماں، بیوی اور بچے دو دن سے صرف چاول کے ستو اور نمکین چائے پر گذارہ کر رہے تھے۔ ریلیف میں جو چند کھلے بسکٹ ملے تھے ان کا ذائقہ بھی خراب ہو چکا تھا۔کل شام جب کھانے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا تو بچوں نے وہی بدبودار بسکٹ نمکین چائے کے ساتھ کھا لئے تھے۔

سرتاج گھوڑا بان تھا۔اس کے پاس خوبصورت گھوڑا تھا جس کا نام اس نے ایک انگریز کے نام پر راکا رکھا تھا۔وہ ہر سال راکا کو لے کر پہلگام جاتا تھا۔پہلگام جو کشمیر کا سب سے زیادہ پرکشش اور خوبصورت صحت افزا مقام ہے۔ یہاں مزہ کرنے کے لئے گھوڑسواری سب سے بڑا شوق ہے اور دنیا کے کونے کونے سے اس کے شائقین آتے رہتے ہیں۔ یہاں

کا ٹورسٹ سیزن اپریل سے شروع ہوکر اکتوبر نومبر تک ہی رہتا تھا لیکن اب کچھ سالوں سے ٹورسٹ کو برف دیکھنے کا چسکہ بڑھنے لگا تو پہلگام کے ہوٹل والے، دکاندار، مزدوروں کے ساتھ ساتھ گھوڑے بانوں کا بھی اچھا خاصا کام چل نکلا تھا۔ سرتاج غریب آدمی تھا۔ جب مزدوری مل جاتی تھی اس دن مزے سے کھانا کھاتے تھے ورنہ اکثر چاول اور چٹنی پر ہی گذارہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر دن رات مزدوری کر کے کچھ پیسہ بچا کر اس نے بڑی مشکل سے راکا کو خریدا تھا۔ راکا شاندار گھوڑا تھا اور سارے پہلگام میں راکا کی وجہ سے سرتاج بھی بہت مشہور ہو چکا تھا۔ گھوڑ سواری کے شوقین سیاح دور سے ہی دیکھ کے راکا کو پسند کرتے تھے۔ جب سے سرتاج راکا کو لیکر پہلگام آیا تب سے ان کے گھریلو حالات میں تھوڑا بہت سدھار بھی آ گیا تھا۔۔۔ سرتاج جتنا کماتا تھا وہ سب خرچ کر دیتا تھا۔۔۔ ماں بیوی اور بچوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے بچے اب اسکول بھی جانے لگے تھے۔ بیوی خوش تھی۔ ماں ہر نماز میں دعائیں مانگتی تھی۔ وہ جب بھی پہلگام سے گھر آتا تھا۔ بچوں کے لئے کوئی نہ کوئی کھلونا، سارہ کے لئے کوئی سامان اور ماں کی پسند کی پنیر ضرور لاتا تھا۔

سب کچھ صحیح جا رہا تھا کہ اچانک حالات بگاڑ دیئے گئے۔ سیاحوں کو وادی چھوڑنے کا سرکاری آدیش دیا گیا۔ خراب حالات کی وجہ سے سارے ٹورسٹ بھاگ گئے۔ پہلگام سونا پڑ گیا۔ ہوٹل والے، دکاندار، مزدور سب گھروں کو واپس لوٹ آئے۔ سرتاج بھی راکا کو کر لے کر گھر آ گیا۔ گھر آ کر کچھ دن ٹھیک سے گذرے۔ لیکن کتنے دن۔ ابھی کام شروع ہی ہوا تھا کہ یہ افتاد پڑ گئی۔ گھر میں جو جمع پونجی تھی وہ سب ختم ہوگئی۔ اب کھانے کے لالے پڑھ رہے تھے۔ کرفیو کے دن بڑھائے جا رہے تھے۔ اڑوس پڑوس سے بھی اب کوئی توقع نہ رہی تھی۔

پیٹ خالی ہو تو ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آنے لگتی ہے۔ ہاتھ خالی ہو تو برے برے

سپنے آتے ہیں۔ گھر میں پیسہ بچا تھا نہ کھانے کا کوئی سامان۔ بھوک سے پیٹ جلنے لگے تھے۔ بچے کھانا مانگ رہے تھے۔ سرتاج کو اپنے سے زیادہ راکا کی فکر لگی تھی۔ اس کا ایک دن کا کھانا ان کے خاندان کے لئے دس دن چل سکتا تھا۔ ان حالات میں جب کھانے کے لالے پڑ رہے ہوں تو گھوڑے کا کیا کریں۔ یہی وہ ساری چیزیں تھیں جس کے لئے سرتاج کے ساتھ ساتھ اس کی ماں اور بیوی بھی بہت پریشان ہو رہی تھیں۔

''کسی سے ادھار مانگ لے سرتاج۔''

''سارہ تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم کو کیا لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے واسطے کسی سے نہیں مانگا ہوگا۔ کس کس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ کسی نے ہاتھ سہلایا تو کسی نے ٹرخا دیا۔ جو قریب کے لوگ ہیں وہ میرے جیسے ہی محتاج ہیں۔ مجھ ہی سے مانگ کر مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔ اب تو بس ایک ہی سہارا ہے۔''

وہ رات سرتاج اور سارہ نے آنکھوں میں کاٹ لی۔ وہ صبح صادق تک اپنی بیوی کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا رہا اور آخر وہ دل دہلانے والا فیصلہ سنایا جسے سن کر سارہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ لیکن سرتاج کو گھر چلانے کے لئے پیسہ چاہئے تھا اور پیسہ آنے کا اور کوئی آسان راستہ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے بیوی کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر نہ چاہتے ہوئے بھی سارہ نے اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکا لیا۔۔۔

خیالات۔ احساسات۔ اور جذبات اگر منتشر بھی ہوں۔۔۔ ان کو یکجا کرنے اور ایک ڈگر پہ لانے کے لئے تحفظات کا ایک پُل فراہم کیا جائے تو سب اپنے راستے پر لوٹ آتے ہیں۔ نہیں تو انسان بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اور سرتاج پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ بکھر چکا تھا۔

آج رات دیر گئے جب ماں اور بچے سو گئے۔ سرتاج نے سارہ کو ساتھ لیا۔ اور دونوں طبیلے میں راکا کے پاس پہنچ گئے۔ گھوڑے نے مالک اور مالکن کو آتے دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ہنہنایا۔ لیکن اس کے منہ سے نحیف آواز نکل رہی تھی۔ راکا بہت زیادہ لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ سرتاج نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو گھوڑے نے مستی سے سر اوپر اٹھایا اور پیار سے تھوتنی سرتاج کے کاندھے پر رکھ دی۔

''نا سرتاج نا۔۔۔میرا راکا نہ لے جا۔۔۔میرا بیٹا، میرا سہارا نہ لے جا''

''میں مجبور ہوں سارہ۔ میں مجبور ہوں۔ میرے بچوں کی بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھ سے تیری اداس آنکھوں کی ویرانی اور ماں کے سوکھے ہونٹوں پر بھوک سے جمی کایا دیکھی نہیں جاتی۔ راکا میرا گھوڑا نہیں میرا بیٹا ہے۔ میرا بڑا بیٹا۔ میرا سہارا۔ پر میں کیا کروں۔ تم اسے میری خودغرضی کہہ لو لیکن مجھے میرے بچوں کی جان راکا سے زیادہ پیاری ہے۔ اور تم لوگوں کی خاطر اگر مجھے اپنی جان بھی بیچنی پڑے تو میں وہ بھی کر لوں گا۔ راکا ہمارا آخری سہارا ہے اور جاتے جاتے بھی یہ ہمیں سہارا دے کے ہی تو جا رہا ہے۔''

سارہ نے راکا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ روئے بھی جا رہی تھی۔ اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ سرتاج نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ دونوں نے راکا کی لگام پکڑ لی اور اسے طبیلے سے باہر نکال لائے۔ راکا ہر بات سے بے خبر بڑی شان سے اپنے مالک اور مالکن کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ سرتاج نے سارہ کو واپس گھر بھیج دیا اور خود رات کے اندھیرے میں راکا کو لے کر اپنے گاؤں سے نکل آیا۔۔۔

توقع سے بھی کم پیسے ہاتھ میں لے کر سرتاج کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔ وہ الٹ پلٹ کر پیسے بار بار گن رہا تھا۔

''دیکھو سرتاج ان حالات میں تیرا گھوڑا کوئی نہیں خریدے گا۔۔۔ یہ جرم ہے جو میں کر رہا ہوں۔لیکن میں اس سے زیادہ پیسے نہیں دے سکتا۔میں نے جتنے پیسے دیئے نا وہ بھی بہت ہیں۔اور ہاں یہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں لگنی چاہیئے۔ ورنہ دونوں قانون کی زد میں آجائیں گے''

سرتاج ہچکچا رہا تھا۔اس نے حسرت سے راکا کی طرف دیکھا۔راکا کی آسیب زدہ آنکھوں میں اسے بھوک کے خوفناک سائے تیرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔اس کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے نمی میں تر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔وہ راکا سے زیادہ اپنے بچوں کے لئے فکر مند تھا۔اس نے بڑی بے دلی کے ساتھ پیسے جیب میں ڈال لئے اور راکا کو لے کر قصائی کے ساتھ مذبح خانے کے اندر چلا گیا۔۔۔

☆☆☆

بے وفا

''دیکھو میں تمہیں کہہ چکا ہوں ۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کرسکتا۔نہیں کر سکتا۔''

''کس نے کہا آپ میرے ساتھ شادی کرو۔۔۔شادی تو میں آپ کے ساتھ کر رہی ہوں۔''

''دیکھو یہ پاگل پن ہے جوتم کررہی ہو۔اس سے باہر آ جاؤ۔پچھتاؤ گی۔''

''میں تو پچھتانے کے لئے ہی آپ کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پچھتانے دو نا مجھے پلیززززز۔''

''سمجھا کرولڑکی ۔تم ابھی جوان ہو۔خوبصورت ہو۔کوئی بھی نوجوان تمہارے ساتھ شادی کرسکتا ہے۔تم خوشحال زندگی گزارسکتی ہو۔میرے تو صرف دوسال نوکری کے بچے ہیں۔پھر میں رٹائیر ہوجاؤں گا۔''

''سنئے سنئے۔۔۔سنئے نا۔۔۔آپ کی یہ باتیں تو میں کئی بارسن چکی ہوں۔جانے کیوں محبت کے بیچ میں آپ اپنی عمر ڈال رہے ہیں۔کیا میں نے کبھی آپ کو اپنی عمر کے بارے میں بتایا۔نہیں نا۔جب میری چھوٹی عمر ہماری شادی میں رکاوٹ نہیں بن رہی ہے تو آپ کیوں بار بار اپنی عمر کو لے کر محبت کا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔''

یوں تو لیاقت علی اٹھاون سال کا تھا لیکن وہ ابھی بھی چالیس بیالیس سال کا لگ رہا تھا۔کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔جن میں وہ کبھی بھی کوئی کلر نہیں کرتا تھا۔ چہرہ سرخ سفید۔قد ساڑھے پانچ فٹ اور جسم متناسب۔آنکھیں روشن اور لہجہ نرم تھا۔اس کے دوستوں

کی تعداد لمبی تھی۔ جب سے سوشل میڈیا آیا تب سے اس کے دوستوں میں دن بدن اضافہ ہی ہورہا تھا۔اب تو کئی خواتین کے ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ پانچ سال پہلے اس کی بیوی مر چکی تھی ۔اس کے دو بیٹے سرکاری ملازم تھے۔دونوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ اپنے شہر سے دور اپنی فیملیز کے ساتھ خوش تھے۔ کبھی کبھار ہی گھر آجاتے تھے یا کبھی چھٹیوں میں لیاقت علی ان کے پاس جاتا تھا۔ ویسے انہیں ایک دوسرے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

لیاقت علی کے گھر میں دو نوکر تھے جو گھر کی دیکھ بھال اور سیب کے باغات کی رکھوالی کرتے تھے۔ ویسے لیاقت علی آفس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت ایک اخبار کے دفتر میں گزارتا تھا۔ یہ اخبار اس کے ایک دوست کا تھا۔ جہاں وہ بلا معاوضہ اخبار کی معاونت کرتا تھا۔ وہاں اس کا اچھا وقت گزر جاتا تھا۔سحرش چار پانچ مہینے پہلے اسے فیس بک پر مل گئی تھی۔ اس کی فرینڈ ریکویسٹ کنفرم کرتے ہی سحرش مسینجر پر بات کرنے لگی۔ پھر یہ سلسلہ رکا نہیں۔ یوں تو مسینجر پر لیاقت علی کی باتیں دنیا بھر کے لوگوں سے ہوتی تھیں جن میں خواتین کی بھی بڑی تعداد تھی لیکن سحرش نے آہستہ آہستہ لیاقت علی سے اس کی ذاتی معلومات حاصل کر لیں اور وہ فیس بک فرینڈ کم رہے اور ذاتی دوست زیادہ بن گئے۔لیاقت علی کو بھی اس کے ساتھ باتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ وہ بڑی شائستہ اور علم دوست لڑکی تھی۔اب یہ دونوں زیادہ تر فون پر بات کرتے تھے اور گھنٹوں کسی بھی موضوع پر رواں تبصرہ کر لیتے تھے۔لیاقت علی کا مہینہ دو مہینے کے بعد دلی جانا ہوتا تھا۔تو یہاں ان کو ملنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔سحرش فون پر جتنی بے باکی سے گفتگو کرتی تھی سامنے آکر وہ اتنا ہی خاموش خاموش رہتی تھی اور صرف لیاقت علی کی سنتی تھی۔ دلی میں وہ ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔تو ان کی دوستی آہستہ آہستہ پیار میں ڈھل چکی تھی۔سحرش اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔اور ماس کام میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔

یہ اس کا آخری سال تھا۔ پرنٹ میڈیا کے بارے میں وہ لیاقت علی سے بہت ساری مفید باتیں سیکھ چکی تھی اور ہمیشہ اپنی کم کہتی تھی اور لیاقت علی کی زیادہ سنتی تھی۔لیاقت علی دہلی میں دو بار اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گیا۔ جہاں اس کی ماں اور بہن بھائیوں سے ملاقات ہوگئی۔ اس دوران سحرش بھی ایک بار کشمیر آ گئی۔اور لیاقت علی نے اسے پورا کشمیر دکھایا۔کشمیر کے صحت افزا مقامات میں پہلگام اسے زیادہ پسند آیا۔ حالانکہ وہ گلمرگ گئی ۔ برف پر سکیٹنگ کی۔ گنڈولا سے گلمرگ کی وادیاں دیکھ لیں۔ڈل جھیل میں شکارے پر بیٹھ کر چار چناری ،نشاط ، شالیمار کی سیر کی ۔ دوراتیں ہاؤس بوٹ میں بھی گذار دیں ۔ ہارون، چشمہ شاہی۔اچھہ بل ویری ناگ دیکھا۔مغل باغات کے ساتھ ساتھ وہ ساری نئ جگہیں بھی دیکھ لیں جو گھومنے کے لائق تھیں۔سارا کشمیر گھومنے کے بعد بھی جانے اسے پہلگام زیادہ اچھا کیوں لگا۔یہ تو باتوں باتوں میں اسے بعد میں پتا چلا کہ پہلگام تو لیاقت علی کی بھی پسندیدہ جگہ ہے۔ وہ پہلگام کو پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اسے پہلگام کے ساتھ عشق تھا۔عشق کی بات آ گئی تو سحرش نے برامان لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ لیاقت علی عشق صرف اسی کے ساتھ کرے۔کوئی تیسراان کے پیار کے بیچ نہ آئے۔چاہے وہ دنیا کی حسین ترین جگہ پہلگام ہی کیوں نہ ہو۔

دونوں نے دلی اور کشمیر میں کتنے دن ساتھ گزارے۔عشق اور عاشقی کی ہزار ہا باتیں کیں۔کشمیر کی پھولوں بھری وادیوں اور یہاں کے سبزہ زاروں۔لالہ زاروں اور آبشاروں نے سحرش کے انگ انگ میں عشق و مشک کی مستی بھر دی۔ وہ لیاقت علی کو جب بھی دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا جاتا تھا مگر کیا مجال کہ دونوں میں سے ایک نے بھی دوسرے کا جسم حاصل کرنے کی سوچی ہو۔وہ دونوں تو دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کی چاہتوں میں گم تھے۔بس کشمیر سے جاتے وقت ایرپورٹ پر الوداعی کلمات میں سحرش نے صرف اتنا کہا تھا

''میں بہت جلد آپ کے ساتھ شادی کروں گی۔''

''کیا۔۔۔؟'' لیاقت علی جیسے اس اچانک حملے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔

''یس۔۔۔آئی مین اٹ۔۔۔''

اس کے بعد جب وہ فیس بک یا فون پر بات کرتے تھے تو سحرش ایک ہی رٹ لگائے رہتی تھی کہ وہ شادی کب کر رہے ہیں؟

لیاقت علی نے اسے کئی بار سمجھایا۔ دنیا کے رسم ورواج بتائے۔ سماجی خوف وڈر کی دہائی دی۔ لیکن سحرش ایک بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ حالانکہ لیاقت علی کو سماج کی زیادہ پرواہ بھی نہیں تھی اور نہ اسے اپنے بیٹوں سے کوئی ڈر تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سحرش اور اس کی عمر میں چوبیس پچیس سال کا فرق تھا۔ جو اچھی بات نہیں تھی۔

'' کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہو۔ میں تمہیں کیا دے پاؤں گا۔ میری ملازمت کے صرف دو سال بچے ہیں۔۔۔ پھر

''پھر کیا۔ پھر تو زیادہ آرام کی زندگی ہوگی۔ نہ آفس کی پریشانی، نہ کہیں آنے جانے کی جھنجٹ۔ پھر تو موجاں ہی موجاں ہے۔''

''پاگل۔۔۔ جب رٹائرمنٹ کی زندگی شروع ہوگی۔ اس کے بعد میں تمہارا کتنا ساتھ دے پاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال۔''

''وووووو۔۔۔ دس بارہ سال۔۔۔ یہ تو بہت بہوووت ہیں۔ میں تو یہ مان کے چلتی ہوں' سو برس کی زندگی سے اچھے ہیں۔ پیار کے دو چار دن۔''

''یہ کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ پھر کیا کروگی یہ پہاڑ سی زندگی لے کر۔''

''میں تو چاہتی ہوں کہ تم سو سال سے بھی زیادہ جیو۔ پھر اس میں سے تمہاری جتنی مرضی مجھے اتنا ہی وقت دے دینا۔ دس سال۔۔۔ میں تو بس سال دو سال مانگتی ہوں۔

وہ بھی مل جائیں تو بہت ہیں۔''

پھر لیاقت علی کی ایک نہ چلی اور سحرش کے ساتھ شادی کر لی۔ وہ لیاقت علی کی ایک ایک بات کا خیال رکھتی تھی۔ جس میں اس کی خوشی ہوتی وہی اپنے لئے بھی خوشی بنا لیتی۔ لیاقت علی کو کچھ سوچنے کی مہلت بھی نہیں مل رہی۔ ابھی اس کے دل میں کوئی خیال سر ہی اٹھاتا تھا تو سحرش اس کی تکمیل میں کھڑی ہوتی تھی۔ لیاقت علی کو ساری زندگی میں اتنی خوشیاں نہیں ملی تھیں جتنی سحرش سے اسے اس ایک سال میں ملی تھیں۔ کبھی کبھی لیاقت علی کو لگتا تھا کہ سحرش کچھ تھکی تھکی سی لگتی ہے تو یہی سوچتا تھا کہ دہلی کی لڑکی ہے اور پڑھائی لکھائی میں بڑی رہی ہے۔ شاید بہت زیادہ گھریلو کام خود کرنے سے تھکتی ہے یا کشمیر کی ہوا کا فرق پڑا ہے۔ وہ بار بار اسے کام کرنے سے روکتا تھا، اور گھر کے نوکروں سے کام کرانے کے لئے کہتا تھا، لیکن سحرش کو لیاقت علی کے سارے کام خود کرنے میں مزا آتا تھا۔

ایک دن لیاقت علی صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ سحرش چائے کی ٹرے لیکر آ گئی۔ ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھتے ہی وہ دوسرے صوفے پر گر گئی۔ حالانکہ اس نے خود کو کافی سنبھالا تھا۔ صوفے کا بازو پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ لیاقت علی جلدی سے اٹھا۔ سحرش کو آوازیں دیں لیکن وہ ہوش میں نہیں تھی۔ نوکروں کی مدد سے وہ اسے ایک بڑے اسپتال میں لے آیا۔۔۔

پرائیوٹ اسپتال میں سحرش کو کئی گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ تب تک ٹسٹ کرانے کے لئے اس کے کئی بار بلڈ سمپل لئے گئے۔ لیاقت علی یہاں سے وہاں دوڑتا رہا۔ کچھ قریبی دوست بھی آ گئے تھے۔ لیکن شام تک وہ لوگ بھی چلے گئے جب سحرش کو پوری طرح سے ہوش آیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اب وہی سحرش کے ٹسٹ جمع کر رہا تھا اور لگاتار ڈاکٹروں سے مل رہا تھا۔ آخر وہ ٹسٹ اور ضروری کاغذات کا پلندہ لیکر تھکا ہارا سحرش کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ سحرش نے

آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر لیاقت علی کو دیکھنے لگی۔لیکن لیاقت علی اس کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے پایا۔وہ ایک ٹک سحرش کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم جانتی تھیں؟۔''

''ہاں۔۔۔''سحرش نے مختصر جواب دے دیا

''کب سے؟''

''جب میں کشمیر آئی تھی۔اور جاتے وقت آپ کو شادی کا پرپوزل دیا تھا۔''

''کیوں کیا ایسا تم نے۔''

''میں زندگی کے یہ آخری پل آپ کے ساتھ گذارنا چاہتی تھی۔ان کو حسین بنانا چاہتی تھی۔مجھے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ ایک سال اور جی پاؤں گی۔۔۔ لیکن دیکھونا،تمہارا پیار مجھے دوسرے سال میں لے کر آ گیا۔شاید ابھی بھی کچھ اور دن جیوں تمہارے ساتھ۔''وہ مسکرا رہی تھی۔لیاقت علی کے ہونٹ بند تھے۔لیکن اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی تھی۔

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ۔۔۔''سحرش نے اپنی لرزتی انگلیوں سے اس کے آنسوں صاف کرنے کی کوشش کی۔لیاقت علی نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔اب سحرش کے ضبط کا بھی باندھ ٹوٹ چکا تھا۔وہ زور زور سے رو رہی تھی۔اور لیاقت علی اسے سینے سے لگا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔روتے روتے سحرش کی ہچکی بندھ چکی تھی۔

''دیکھونا مجھے کتنا اعتبار تھا تم پر۔مجھے یقین تھا کہ اگر میں مروں گی تو تمہاری ہی بانہوں میں مروں گی۔''

''بے وفا۔۔۔سچ کہتے ہیں کہ یہ لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں۔وقتِ ضرورت پر ہی دھوکہ دیتی ہیں۔''

سحرش اپنا چہرہ لیاقت علی کے سینے کے ساتھ رگڑ رہی تھی ۔اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہورہی تھیں ۔لیکن معصوم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جیسے ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

چیل چنار اور چوزے

نیلوفر تھکن اور ذہنی انتشار کے بعد نیند کی وادی میں چلی گئی تھی ۔صبح صادق کے قریب ''ہُول ہُول'' کی خوفناک آواز سن کر نیند سے بیدار ہوگئی ۔گاوں کی ساری عورتیں ایک ساتھ ''ہُول ہُول'' چلا رہی تھیں ۔شاید چنار سے چیل پھر اُتر آئی تھی اور آنگن میں ننھے ننھے مرغی کے چوزوں پر جھپٹ پڑی تھی ۔۔۔نیلوفر کی روح کانپ اٹھی ۔۔

''ہُول ہُول'' کی آوازیں تیز ہوتی ہوئی نیلوفر کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں ۔وہ خوف زدہ ہوکر ایک دم بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ پڑوس میں عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں ،ساتھ میں مردوں کی دبی دبی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں ۔کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ۔وہ عامر اور اسلم کے لئے پریشان ہورہی تھی ۔اس نے ماچس کی تیلی جلائی ۔غور سے اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھنے لگی جو گہری نیند میں سوئے تھے ۔اُس کی جان میں جان آ گئی ۔۔۔

اس نے آہستہ سے کھڑکی کا آدھا پٹ کھول کر باہر جھانکا ۔۔۔باہر سڑک پر کافی لوگ جمع تھے اور شور غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ۔ وہ جب تک دوڑتے دوڑتے شور والی جگہ پر پہنچ گئی تب تک چیل چوزے کو لیکر اُڑ چکی تھی اور عورتیں چیختی چلاتی اور شور مچاتی ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں ۔ بوڑھی عورتیں ایک طرف بین کر رہی تھیں ۔ جبکہ مرد غصے میں ہونٹ کاٹ رہے تھے یا عورتوں کو ڈانٹ رہے تھے ۔عبدالرحمٰن کا جسم جیسے شل ہو چکا تھا ۔ اس کی بیوی سینہ کوبی کر رہی تھی ۔نیلوفر اور دوسری عورتیں آنسوں بہاتے اس کو دلاسہ دے رہی تھیں ۔وہ غمگین ہوکر واپس صحن میں آ گئی اور چنار کی طرف دیکھنے لگی ۔ پو پھٹنے کے باوجود اس

کی گھنی چھاؤں میں ابھی بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور سنائی دے رہی تھیں تو چوزے کی دلخراش چیخیں۔

تب نیلوفر بہت چھوٹی تھی جب ماں نے اس کو چوزوں کی رکھوالی پر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی چاق چوبند رہنے کے لئے اکثر اُسے جھڑکتی بھی رہتی تھی۔لیکن پھر بھی چنار سے دو چیلیں اُتر آتیں اوراس کی آنکھوں کے سامنے دو چوزے اٹھا کر لے جاتیں ۔ایک دن ماں نے اسے بہت مارا۔دو چوزوں کے بدلے شاید اس کی جان ہی لے لیتی ، وہ تو بابا بیچ میں آ گئے اوراس کی جان چھوٹی۔۔۔لیکن تب سے نیلوفر کو چوزوں کی زیادہ فکر رہنے لگی اور ساتھ ساتھ وہ چیل کی حرکات وسکنات پر بھی آنکھیں جمائے رکھتی تھی۔اس کی آنکھ کی پتلیاں ہمیشہ گردش میں رہنے لگی تھیں۔چنار کی اوپری ٹہنی سے لیکر چیل اور چوزوں تک اس کی نظریں اوپر نیچے ہوتی رہتی تھیں۔وہ دن بھر آنگن میں مرغیوں اوران کے چوزوں کے پیچھے دوڑتی رہتی تھی۔کبھی چوزوں کو پکڑ کر ہاتھ میں اٹھاتی، تو کبھی انکو سر پر رکھ کر ناچتی رہتی تھی۔مرغیاں شور مچاتی اس پر حملہ کرتی تھیں۔ایک بار مرغی نے چونچ ماردی۔آنکھ مشکل سے بچی لیکن چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔۔۔

''ہُول ہُول'' کی آوازیں نیلوفر کواور چاک و چوبند بنا دیتی تھیں۔اس کی آنکھوں کی پتلیاں اور تیزی سے گردش کرنے لگتی تھیں۔چیل چنار سے اُترنے کی سوچ ہی رہی ہوتی کہ نیلوفر چوزوں کےاوپر سایہ بن کر کھڑی ہوجاتی ۔لیکن پھر بھی تھوڑی سی بھول چوک کا فائدہ چیل کومل ہی جاتا تھا۔وہ اتر آتی تھی اور جھپٹا مار کر ایک چوزا اُٹھا کر لے جاتی۔تب وہ ڈنڈا لے کر چیل کے پیچھے دوڑتی۔ایک دوبار وہ چیل کے پیچھے دوڑتی دوڑتی چنار تک بھی پہنچ گئی۔چیل چنار کی موٹی شاخ کےاوپر بیٹھی مزے سے چوزے کونوچ رہی تھی اور نیلوفر غصے میں چنار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگتی۔لیکن چنار کا تنا اتنا موٹا تھا کہ وہ اس کے بازوؤں کے

حلقے میں بھی نہیں آ پاتا تھا۔۔۔

اس نے کئی بار اپنے بابا سے بھی کہہ دیا تھا۔

''بابا اس چنار کو جڑ سے ہی کاٹ ڈالو۔ یہ چیل یہاں سے دفع ہوجائے۔ یہ ہمارے چوزوں کی دشمن ہے۔''

بابا حسرت بھری آنکھوں سے چنار کی طرف دیکھتا تھا اور چپ ہوجاتا تھا۔ نیلوفر حیران و پریشان اس کا منہ تکتی رہتی تھی۔ وہ اکثر سوچتی تھی بابا تو روز کاندھے پر کلہاڑا لے کر پیڑ کاٹنے جاتا ہے وہ یہ چنار کیوں نہیں کاٹتا۔شاید بابا اتنے موٹے چنار کو کاٹ نہیں پائے گا بس میں بڑی ہوجاؤں تو اسے خود کاٹ دوں گی۔

ایک عرصہ سے سارا شہر چیلوں کا اسیر تھا۔ یہ چیل اب عام چیلوں جیسی نہیں لگ رہی تھیں۔ پتا نہیں کس نے اور کن سازشوں کے تحت ان کو آدم خور بنا دیا گیا تھا۔اب چوزے، چرند پرند، انسان، سب ان کے شکار تھے۔شہر کے مکین ان کے سامنے خود کو بے بس اور لاچار سمجھ رہے تھے۔ پورے شہر پر خوف اور مایوسی کا سایہ چھایا ہوا تھا۔چیلیں چنار سے اُتر آتی تھیں اور کسی بھی ذی روح پر جھپٹا مار کر چنار کی گھنی شاخوں میں چھپ جاتی تھیں اور نوکیلے پنجوں سے چیر پھاڑ شروع کر دیتی تھیں۔شہر میں بڑے پیمانے پر ہنگامے ہو رہے تھے۔۔ چیلوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور ان کی من مانیاں بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ پھر اچانک کہیں سے گدھ بھی نمودار ہوگئے۔ وہ آنکھوں سے اندھے لگ رہے تھے، جیسے آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ان کے سامنے جو بھی آتا تھا اسے نوچ ڈالتے تھے۔۔۔ان گدھوں کے آتے ہی چیلوں کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ یہ گدھ چیلوں سے بھی زیادہ آدم خور تھے، مردار کے ساتھ ساتھ زندہ انسانوں پر بھی حملہ کرتے تھے۔ جب بھی جھپٹا مار لیتے تھے، دو چار جانوں پر ہاتھ صاف کر جاتے تھے۔

یہ دسمبر کی دھند میں لپٹی ایک اُداس صبح تھی۔ باہر کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔کئی دنوں سے سورج بھی کہیں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔سردی اتنی شدید تھی کہ دانت پر دانت نہیں جمتا تھا۔۔۔ ماحول پر خوفناک سناٹا طاری تھا۔کہیں سے ہلکی سی آواز بھی آجاتی تو بہت ڈر لگتا تھا۔۔۔اچانک ہوا میں کچھ عجیب سا شور برپا ہوا جو آہستہ آہستہ نزدیک آکر چیلوں اور گدھوں کی مخصوص آوازوں میں تبدیل ہورہا تھا۔نیلوفر کا شک یقین میں بدل گیا۔کہیں سے چیلوں اور گِدھوں کی پوری پلٹن آ گئی تھی جو اس کے آنگن میں منڈلا رہے تھے۔

عامر اور اسلم چند منٹ پہلے ہی آنگن میں کھیلنے کے لئے نکلے تھے۔نیلوفر نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔تو اسے باہر کا منظر بڑا ڈراوٗنا اور خوفناک لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح آنگن کی طرف دوڑ پڑی اور دونوں بیٹوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔آس پاس لاتعداد چیل اور گدھ منڈلاتے نظر آرہے تھے۔وہ اب اکھٹے ایک ساتھ بستی کے چوزوں کا شکار کھیلنے نکلتے تھے۔ان کی ہیبتناک آوازوں سے پورا ماحول خوفناک لگ رہا تھا۔۔۔ چیل اور گدھ تیزی کے ساتھ چنار سے زمین پر اُتر رہے تھے۔ایک گدھ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ نیلوفر نے دونوں بیٹوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر رکھا۔گدھ جب نزدیک پہنچ گیا تو اس نے ایک ہاتھ سے سامنے پڑا ڈنڈا اٹھایا۔گدھ چھلانگ مار کر نیلوفر کے سامنے پہنچا۔اس نے ڈنڈا گھمایا گِدھ اپنی مخصوص آواز میں کیں کیں کرکے دور بھاگا۔ غصے میں بپھرے گدھوں اور چیلوں کا پورا جھنڈ نیلوفر کی طرف جھپٹ پڑا۔اس کی پتلیاں حرکت میں آ گئیں۔نگاہیں چیلوں کی جھنڈ پر گاڑ دیں اور آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسکتی رہی۔اچانک ایک مکروہ گدھ نے اس کے سینے پر جھپٹا مارا۔ جہاں اس کے کلیجے کے ساتھ عامر اور اسلم چمٹے تھے۔دوسری طرف سے ساری چیلیں ٹوٹ پڑیں اور اس کے بچوں پر پنجہ مارا۔دونوں بھاری بھرکم گدھوں کے پنجوں میں تڑپنے لگے۔نیلوفر اپنے بچوں کو تڑپتا دیکھ کر بدحواس سی ہوگئی اور ان کو چھڑانے کے لئے

دوڑ پڑی۔ایک چیل نے پنجہ مار کر اسے نیچے گرا دیا۔پھر گدھوں اور چیلوں نے اسے نوچ کر رکھ دیا۔وہ زخموں سے چور چور ہو کر بے ہوش ہو گئی ۔۔۔اور پھر کہیں دور بچپن کی وادیوں میں اُتر آئی۔۔۔

''ہُول ہُول'' کی آواز نیلوفر کی سماعت سے ٹکرائی ، وہ دوڑتے ہوئے آنگن میں آئی اور تناور چنار کی طرف دیکھنے لگی۔اوپر کی شاخ پر چیل چوزے کی تکا بوٹی کرنے میں مست تھی۔اسے لگا جیسے چیل چوزے کو پنجے میں رکھ کر سامنے ہی بیٹھی کہہ رہی ہے۔

''دیکھ تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔۔۔''وہ دوڑ کے اندر گئی۔معصوم ہاتھوں میں بابا کی کلہاڑی اٹھا لائی اور غصے میں چنار کے تنے پر مارنے لگی۔اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں بہت درد ہو رہا تھا۔اس کا سارا جسم پسینے میں تر تھا۔لیکن وہ چنار کو کاٹ نہیں سکی۔

اس نے کلہاڑی پھینک دی۔اپنے ننھے ہاتھوں میں چہرا چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔۔۔ اور چیل۔۔۔کسی اور کے آگن میں اترنے کے لئے پر تول رہی تھی۔

☆☆☆

درد حد سے گذر جائے تو۔۔۔

تاج بیگم کے گھر میں مرد نام کے دو ہی لوگ تھے۔ایک اس کا بوڑھا سسر قادر بٹ جسے دن کی روشنی میں بھی دھندلا دکھائی دیتا تھااور دوسرا اس کا بیٹا ماجد۔ ماجد دیکھنے میں گبرو جوان لگتا تھا۔مضبوط ہاتھ پیر۔ لمبے بال۔ چہرے پر اُگ رہی خشخش داڑھی۔ آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے۔چہرے پہ مسکراہٹ جیسے منجمد ہوکر رہ گئی تھی۔ لیکن دماغی طور وہ تھوڑا سا کمزور تھا۔ بس لمبے قد کاٹھ کی وجہ سے اس کو آٹھویں میں رکھا گیا تھا۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی سارے گھروں میں روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔زندگیاں متحرک ہوگئی تھیں۔نمازی مسجدوں کا رخ کر رہے تھے کہ اچانک پاس والی مسجد کے لاوڈ اسپیکر سے مسجد کے مولوی کی نحیف اورتھرتھراتی آواز آئی۔

''یہ سارا گاؤں فوج کے محاصرے میں ہے۔تاحکم ثانی کوئی بھی فرد اپنے گھر سے باہر نہ آئے۔ جولوگ مسجدوں میں آچکے ہیں وہ بھی باہر نہ جائیں۔تھوڑی دیر میں گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔'' پھر اس کے بعد ساری مسجدوں کے لاوڈ اسپیکر خاموش ہوگئے اور یہ خاموشی اتنی گہری تھی کہ گھر کے لوگ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن تک سن رہے تھے۔ پھر پو پھٹنے تک جیسے صدیاں بیت گئیں۔

مسجد کا لوڈاسپیکر پھر چیخ اٹھا تو گھروں میں دبکے بیٹھے لوگوں کی جان ان کے حلق تک آ گئی۔

''تمام مرد لوگ گھروں سے باہر آجاؤ اور گاؤں کے بڑے جنازہ گاہ میں جمع ہوجاؤ۔وہ تمام لڑکے بھی باہر آجائیں جو دسویں جماعت سے اوپر پڑھ رہے ہیں۔''

تاریخ میں صدیوں کی اہمیت سالوں جیسی ہی ہوتی ہے۔ بس کچھ مدت پہلے ہی کی بات ہے۔ جب وادیِ شین ایک آزاد ریاست تھی اور وادیِ امن کہلاتی تھی۔ لیکن کچھ اپنوں اور کچھ پاس پڑوسیوں کی مہربانیوں سے یہاں کے حالات اتنے خراب کر دیئے گئے کہ اس کی آزادی ہی سلب کر لی گئی۔ بس پھر یہاں طاقت اور طاقتوروں کی ہی اجارہ داری رہی۔

گاؤں کے سارے لوگ جنازہ گاہ میں جمع ہو رہے تھے۔ جوان اور بوڑھے لوگوں کے ساتھ چھوٹے لڑکے بھی آرہے تھے۔ جن کو فوجی دھمکا کر بھگا رہے تھے اور وہ ہنستے کھیلتے، مذاق اُڑاتے جنازہ گاہ سے باہر نکل تو گئے لیکن وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ یہ روز روز کے کریک ڈون۔ تلاشیاں۔ گرفتاریاں یہاں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے اب کھیل تماشا تھا اور وہ اس ماحول میں بھی اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈ لیتے تھے۔

فوجی گاؤں میں تلاشی مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے کئی نوجوان تھے جن کو وہ مارتے پیٹتے اپنے آگے رکھ کر ڈھال کے طور استعمال کر رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں کسی گھر سے حملہ نہ ہو جائے۔ اور اگر کہیں حملہ ہو بھی جاتا تو پہلے وہی نوجوان شکار بنتے جو انہوں نے اپنی ڈھال بنائے رکھے تھے۔ مار کھانے سے سارے نوجوان نڈھال ہو چکے تھے اور کچھ لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فوجی ہر گھر میں بندوقیں تانے گھس رہے تھے۔ ایک ٹیم تاج بیگم کے گھر میں بھی گھس آئی تھی۔ یہاں انہوں نے بوڑھے قادر بٹ اور ماجد کو دیکھا تو اپنی بندوقیں تان دیں۔ ماجد پہلے ان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے کی طرف بھاگنے لگا جہاں اس کی ماں تھی۔ ایک فوجی نے اسے لات مار کر کمرے کے بیچ گرا دیا اور اس کے منہ سے دردناک چیخ نکل گئی۔

تاج بیگم روتے، چیختے آ گئی اور خود کو بیٹے کے اوپر گرا دیا۔ فوجی آگے بڑھے اور

ماجد کو گھسیٹ کر باہر کھینچنے لگے۔تاج بیگم چلانے لگی۔قادر بٹ بھی زور زور سے چلانے لگا۔ ایک فوجی نے ماجد پر بندوق تان دی تو تاج بیگم بندوق والے سے بھڑ گئی۔ پھر کیا تھا فوجیوں نے ماجد، قادر بٹ اور تاج بیگم کو پیٹ پیٹ کر لہولہان کر دیا۔ باہر اطلاع کر دی کہ اندر ایک دہشت گر پکڑا گیا۔ گھر فوجیوں سے بھر گیا۔ سارے گھر میں تلاشی شروع کر دی۔ چاول اور کوئلے ایک ساتھ ملا دیے۔ گھر کے برتن، بستر اور دوسرا ضروری سامان کھڑکیوں سے باہر کیچڑ میں پھینک دیا۔ قادر بٹ اور تاج بیگم کو لاتوں اور بندوق کے بٹوں سے ادھ موا کر دیا اور دونوں کو زمین پر گرا کر ان کے چہروں کو پیروں سے دبا کر رکھا۔ پیروں میں مضبوط جوتے پہنے تھے۔ جن میں بڑی اور کھردری میخیں لگی تھیں۔ جوتوں میں لگی کیلیں ان کے چہروں کو زخمی کر رہی تھیں اور وہ فوجیوں کے پیروں تلے درد سے بلبلا رہے تھے۔فوجیوں نے ماجد کا سر اسی کی چادر سے باندھ دیا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔۔۔

اچانک فوجی متحرک ہو گئے۔ وہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔فوجی آفیسر وائیرلس سیٹ پر ہدایت دے رہے تھے۔لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی تھی۔ وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ شاید تلاشی کے دوران فوج کو کوئی بڑی کامیابی مل گئی ہے جو وہ اتنا متحرک ہو گئے ہیں۔شاید کسی ہائیڈ اوٹ میں بندوق بردار پھنس گئے ہیں یا ہتھیاروں کا کوئی بڑا ذخیرہ ان کے ہاتھ لگا ہے۔ جو بھی ہوا تھا اب کسی کو بھی زندہ بچنے کی امید نہیں رہی تھی۔ گھر جلانے یا کچھ نوجوانوں کی گرفتاریاں بھی ناگزیر تھیں۔ سب کے حلق خشک ہو رہے تھے۔ایک فوجی آفیسر آیا اور لوگوں کے سامنے تقریر شروع کر دی۔

''ہم کو یہ امید نہیں تھی کہ اس گاؤں سے ہم کسی دہشت گرد کو پکڑ لیں گے۔لیکن ابھی ابھی ہمارے جوانوں نے ایک دہشت گرد کو پکڑ لیا ہے۔ جو مار کھانے کے باوجود بھی چپ ہے۔ نہ اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر رہا ہے جو اس نے کہیں چھپا کر رکھے ہیں اور نہ

ہی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ٹھکانے دکھا رہا ہے۔ ہمیں شک ہے اس کے دوسرے ساتھی یہیں تمہارے بیچ بیٹھے ہیں۔ ہم اس کو ''کیٹ'' بنا کر گاڑی میں بٹھاتے ہیں اور تم سب کو اس گاڑی کے سامنے سے پریڈ کر کے گزرنا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی پہچان کرے گا۔ جو یہاں اس بھیڑ میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اس لئے تم لوگ کوئی ہنگامہ یا شور شرابہ نہیں کرو گے۔ خاموشی کے ساتھ پریڈ کرو گے اور گاڑی کے سامنے سے گذرتے جاؤ گے۔ تم لوگ سر اونچا رکھو گے اور اپنا چہرہ گاڑی کی طرف دکھاؤ گے۔''

فوجی آفیسر کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظریں بھی باہر جنازہ گاہ کی اکلوتی سڑک کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں قادر بٹ کو گردن سے پکڑ کر لایا جا رہا تھا اور ایک فوجی تاج بیگم کے بال پکڑ کر اسے کھینچ کے لا رہا تھا۔ کچھ سپاہی دونوں کو بندوق کے بٹوں اور چھڑیوں سے مارتے جا رہے تھے۔ تاج بیگم اپنا ننگا سر ڈھانپنے کے لئے بار بار اپنی چادر سر پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ایک فوجی مذاقاً اس کے سر پر رکھے ہاتھ پر چھڑی سے مارتا جا رہا تھا اور ہنستا بھی جا رہا تھا۔ دونوں کو جنازہ گاہ کے اندر لایا گیا اور ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ قادر بٹ کا چہرہ خون سے تر تھا۔ اور تاج بیگم کے سر سے بھی قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا جو اس کے چہرے کو تر کرتا ہوا اس کے شانوں پر رکھی چادر میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کی چادر جگہ جگہ پھٹ چکی تھی۔ وہ اب بھی اپنے ہاتھ سے پھٹی چادر اپنے ننگے سر پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور یاس بھری نظروں سے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو ان لوگوں کو، اپنے گھر میں ایک دہشت گرد چھپا یا رکھا تھا۔ اگر تم لوگوں نے یہاں چھپے بیٹھے دہشتگردوں کو نہیں دکھایا تو تمہارا حال ان سے بتر کر دوں گا۔'' فوجی آفیسر دانت پیستے بول رہا تھا۔

''کان پکڑی کراؤ بوڑھے سالے کو۔ مرغا بناؤ اس کو۔''

آفیسر نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا۔ جو زبردستی قادر بٹ کو مرغا بنا رہے تھے لیکن اسے مرغا بننا نہیں آتا تھا اور وہ بار بار گر جاتا تھا۔فوجی اسے لاتیں اور گھونسے مارتے جا رہے تھے۔

پھر جب جنازہ گاہ کے گیٹ پر گاڑی کھڑی کر دی گئی تو سب نے دیکھا کہ گاڑی میں تاج بیگم کا نیم پاگل بیٹا ماجد تھا۔اب سب کو فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں ماجد خوف میں کسی کو بھی نہ اٹھوا لے۔سب ڈرے سہمے گاڑی کے سامنے سے گذرتے رہے۔لیکن ماجد نے کسی کو بھی نہیں پکڑوایا۔اس پر فوجی آفیسر کو زیادہ غصہ آیا اور ماجد کو سخت گیر دہشت گرد سمجھ کر گاڑی سے نیچے اتروایا اور سب کے سامنے اسے پیٹتا رہا۔کئی بار اس پر بندوق بھی تان دی۔تاج بیگم بہت رو رہی تھی اور بڑی ناامیدی کے ساتھ آفیسر سے التجا کر رہی تھی۔ پھر لوگوں کی بھیڑ میں سے ایک ماسٹر جی نے جرأت کی اور فوجی آفیسر کو بتا دیا کہ یہ لڑکا ذہنی طور مفلوج اور نیم پاگل ہے۔جس پر فوجی آفیسر کو اور زیادہ غصہ آیا۔اس نے اپنے سامنے کھڑے ایک فوجی کو اشارہ کیا جس نے ماسٹر جی کو دو چار بار بندوق کے بٹ مارے اور وہ ڈرا، سہا خود کو بچاتا لوگوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔۔آفیسر وائیرلس سیٹ پر کسی سے بات کرتا رہا پھر لوگوں کے قریب آ کر بولا۔

''سب لوگ بیٹھے رہو اور بیٹھے بیٹھے ہی پیچھے کی طرف مڑ جاؤ۔'' آفیسر نے حکم دیا تو جنازہ گاہ میں جمع سارے لوگ بیٹھے بیٹھے ہی پیچھے کی طرف مڑ گئے۔

''اپنے سر نیچے کرو۔کوئی بھی شخص تب تک پیچھے کی طرف نہیں دیکھے گا۔جب تک کہا نہ جائے۔'' سبھی لوگوں نے سر جھکا دیئے۔دیر تک خاموشی چھائی رہی۔کسی کو کچھ نہیں پتا کہ کیا ہو رہا ہے۔پھر دور سے کچھ بھنبناہٹ سی سنائی دی۔جو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی ہنسی تھی اور ان کی مذاق اڑانے والی کلکاریاں تھیں جو لوگوں نے سنی اور آہستہ آہستہ اپنے سر اوپر

اٹھائے۔ بڑی حیرانی کے ساتھ اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ پیچھے ان کے اپنے بچوں کے سوا کوئی بھی دوسرا نہیں تھا۔ وہ سب کھڑے ہوگئے۔اور دائیں بائیں دیکھنے لگے۔تب بچوں سے انہیں پتا چلا کہ فوجی تو کب کے جا چکے تھے اور وہ ماجد کو بھی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔

بیٹے کی جدائی والے صدمے سے تاج بیگم شاید پاگل ہی ہوجاتی۔لیکن بھلا ہو گاؤں کے اسکول ماسٹر کا جس کی بھاگ دوڑ اور کوششیں رنگ لائیں اور ایک مہینے کے بعد وہ آج ماجد کی لاش لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔اب تاج بیگم کے چہرے پر کوئی دکھ، کوئی ملال نہیں تھا اور وہ اب پر سکون لگ رہی تھی۔اس نے ماجد کی لاش اپنے آنگن میں دفنا دی۔ اور گھر کا دروازہ اکھاڑ کر الگ رکھوا دیا۔۔۔

☆☆☆

نالائق

''اے نالائق ۔۔۔کیا لکھ دیا یہ۔''امجد نے ارشد کی ہوم ورک کاپی ہاتھ سے چھین لی۔

''نالا یک''ارشد کا معصوم سا جواب

''اس طرح سے لکھا جاتا ہے۔؟ تم واقعی نالائق ہو۔یار ارشد کب سمجھے گا تو۔ صحیح لفظ لکھنا کب سیکھ جائے گا۔''

''مجھ سے نہیں ہو پاتا امجد ڈیئر۔کیا کروں''

''دیکھ کیسے لکھا جاتا ہے۔اب سیکھ بھی لے۔نہیں تو فیل ہوجائے گا۔'' امجد بہت دیر تک اپنے دوست ارشد کو مشکل الفاظ لکھنا سکھاتا رہا لیکن ارشد پھر بھی غلطی پر غلطی کرتا جارہا تھا۔

''نالائق''۔امجد نے ارشد کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا اور ارشد ہمیشہ کی طرح زوردار قہقہہ لگا کر کتابیں سمیٹتا رہا۔

ان کے بیچ ''یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گے'' والا جیسا معاملہ لگ رہا تھا۔دونوں کی دوستی سارے گاؤں میں مثالی مانی جاتی تھی۔امجد کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جبکہ ارشد ایک غریب مزدور کا بیٹا تھا۔کہانی وہی ہے اچھے گھر کا لڑکا تعلیم میں بھی اچھا اور غریب کا بچہ پڑھائی میں بھی غریب۔۔۔گاؤں کے اکلوتے ہائی اسکول سے امجد نے اچھے نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل کرلی اور ارشد ایک بھی کتاب پاس نہیں کر پایا۔امجد کا داخلہ پاس والے قصبے کے کالج میں ہوگیا اور ارشد نے پڑھائی چھوڑ کر آٹو رکشہ چلانا شروع کردیا۔ دونوں کو

اپنے اپنے کام سے بہت لگن تھی اور دونوں شد و مد سے اپنے اپنے کام میں جٹ گئے تھے۔

جب تک امجد نے قصبے کے کالج سے گریجویشن مکمل کر لی ارشد آٹو رکشہ سے ٹیکسی کا مالک ہوگیا تھا اور پھر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کام کو شوق بنا دیا اور بہت جلد تین ٹکسیوں کا مالک بن گیا۔ اس کی شادی ہوگئی اور وہ ایک بیٹے کا باپ بھی بن چکا تھا۔ امجد مزید پڑھائی کے لئے شہر چلا گیا اور یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور یوں دونوں دوستوں کو ملنے کا موقعہ بہت کم ملتا تھا۔ اب وہ تب ہی ملتے تھے جب کبھی امجد گھر آجاتا تھا۔ امجد یونیورسٹی کا ہر دل عزیز طالب علم تھا۔ شعر وشاعری سے اس کا شغف اور ادبی ذوق نے اسے اساتذہ کا چہیتا بنا دیا تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات عرشی سے ہوگئی۔ اور یہ ملاقات بڑھتے بڑھتے پیار میں بدل گئی۔ پیار میں عہد و پیمان باندھنے سے پہلے ہی دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ لیکن اسی دوران امجد کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اسے گھر واپس آنا پڑا۔ ماں جو اکثر بیمار رہتی تھی، شوہر کے انتقال کے بعد بستر سے لگ چکی تھی۔ اب امجد کا یونیورسٹی جانا محال تھا۔ آخر اس نے تلخ فیصلہ کر لیا اور گھر بیٹھ کر ماں کی خدمت میں لگ گیا۔ عرشی نے پاس والے ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ ماں کی پنشن اور عرشی کی قلیل تنخواہ سے گھر کے اخراجات چل رہے تھے اور امجد اپنی شعر وشاعری میں گم ہو چکا تھا۔ اسے کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے کسی دور دراز علاقے یا کبھی شہر جانا پڑتا تھا تو جانے آنے کا کرایہ بھی عرشی سے لینا پڑتا تھا۔ ادب کی خبر رکھنے والا ادیب اپنے گھریلو معاملات سے اتنا بے خبر تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس کی بیٹیاں کس کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ یہ عرشی جانتی تھی کہ کس کسمپرسی میں وہ اپنی بیٹیوں کو پڑھا رہی تھی جو آٹھویں اور دسویں جماعت میں پہنچ چکی تھیں۔

امجد کے تب ہوش اڑ گئے جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اور اب عرشی کی معمولی تنخواہ سے گھر چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ شہر یا کسی دور جگہ جانے کے لئے

امجد کے پاس کرایہ جٹانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

ارشد اب علاقے کا بڑا ٹرانسپورٹر بن چکا تھا۔ اس کے پاس کئی پسینجر گاڑیاں تھیں۔ مدد کے لئے اس کے تین بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ بنک اور فائنانس کمپنیاں اس پر بہت زیادہ بھروسہ کر رہی تھیں۔ نئی گاڑیاں خریدنے کے لئے اسے ایڈوانس میں پیسے دیتے تھے۔ ارشد ان کا اچھا گاہک تھا۔ جس پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے تھے۔

ایک زمانہ تھا جب ارشد اور امجد ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے اور اب یہ وقت آیا تھا کہ ان کی ملاقات مہینوں کے بعد کہیں راہ چلتے ہو جاتی تھی۔۔۔ امجد کی ٹھاٹ تھی کہ وہ گھر سے کبھی پیدل نہیں جاتا تھا۔ بلکہ گھر تک آٹو رکھشا منگاتا تھا۔ لیکن اب جب سے اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی گھر سے نکلتا تھا تو پیدل ہی نکلتا تھا۔ اور واپسی بھی پیدل ہی ہوتی تھی۔ ارشد نے کئی بار امجد کو اس طرح آتے جاتے دیکھا تو وہ ٹھٹک گیا۔ اور جب کبھی ان کا آمنا سامنا ہوا اور اس نے امجد میں بہت زیادہ بدلاؤ بھی دیکھا تو وہ کچھ کچھ پریشان ہو گیا۔ امجد زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ ارشد یوں تو امجد کے حالات سے کچھ کچھ واقف تھا۔ لیکن عرصے سے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا نہیں تھا۔ اس لئے حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ لیکن معلوم کرنے کے بعد اسے بہت دکھ ہوا۔ امجد کی بیوی کی معمولی تنخواہ سے گھر کا گذارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔ اور دو جواں بیٹیاں جو مہندی کو ترس رہی تھیں۔

ارشد اپنے دوست کے بارے میں دن رات سوچنے لگا۔ وہ کسی بھی طرح اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ امجد کو جانتا تھا کہ وہ کتنا غیرت مند آدمی ہے اور وہ کسی بھی حال میں اس کی مدد قبول نہیں کرے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ارشد نے سوچا کہ وہ امجد کو کہے گا کہ وہ اس کی ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام کرے۔ لیکن وہ خود ہی اس کی نفی بھی کرتا رہا کہ یہ کام اس کے ادیب دوست کے شایان شان نہیں ہے۔

پھر ایک دن ارشد نے ایک بڑا فیصلہ کرلیا اور وہ امجد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ فیصلہ لینے سے پہلے اس نے کئی بار سوچا۔ اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ مشورہ کیا۔لیکن پھر بھی اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ امجد کہیں برا نہ مان جائے اور ساری زندگی کی دوستی ٹوٹ نہ جائے۔لیکن کسی اور سے بات کہلوانے کے بجائے ارشد نے طئے کیا کہ کچھ بھی ہو جائے، یہ بات وہ خود ہی امجد سے کہہ دے گا۔

یہ بہار کی آمد آمد کے دن تھے۔خوشگوار صبح کو ارشد خوش کن نوید لے کر آیا تھا۔عرشی ہکا بکا تھی۔خوش بھی تھی اور حیران بھی ۔لیکن امجد کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گذر گئے۔ پھر اس نے نم آنکھوں سے اپنے دوست ارشد کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر پہلے ان کو چوما پھر تھرتھراتی آواز میں صرف اتنا ہی بول پایا۔

''ارشد۔۔۔میرے دوست۔ یہ بس کہنے کی باتیں ہیں کہ بیٹیاں ماں باپ کے لئے بوجھ نہیں ہوتی۔لیکن میری کمر اس بوجھ سے واقعی جھکی تھی۔آپ نے میری دونوں بیٹیوں کو اپنی گھر کی بہوئیں بنا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔''

''نہیں میرے دوست یہ احسان میں تم پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر کرر ہا ہوں۔آپ کی بیٹیاں اتنی پیاری اور خوش اخلاق ہیں کہ انہیں کوئی بھی اپنی بہو بنا سکتا ہے۔ میں تو ان کو اپنی بیٹیاں بنا کر لے جا رہا ہوں۔''

''ارشد۔۔۔میرے دوست۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔آج آپ نے اس نالائق دوست کی لاج رکھ دی ہے۔''

''نا۔۔۔نا۔۔۔امجد ڈئیر۔ یہ ''نالایک'' والا سہرہ تم میرے سر ہی ہنے دے تو اچھا ہے۔اسے نہ چھین مجھ سے۔ یہ میرے پاس ہی رہنے دے۔اسے تو میں نے اپنے یار کی نشانی سمجھ کر تعویز بنا دیا ہے۔اور اسے اپنی تقدیر سے باندھ کر رکھ دیا ہے۔''

''ارشد میرے دوست ۔'' امجد اٹھ کر ارشد کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے دوست کو گلے لگا کر زار و قطار رو لیتا ہے

عرشی کی آنکھوں سے بھی آنسوں بہہ رہے ہیں۔ لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی آج برسوں کے بعد مسکرائے تھے۔

☆☆☆

جنگل راج

''وہاں اندھیر نگری چوپٹ راج تھا۔لومڑیاں شیروں کا شکار کر رہی تھیں۔حال یہ تھا کہ شیر کٹتے جا رہے تھے، مارے جا رہے تھے۔لیکن وہ بے دست و پا لگ رہے تھے۔ جنگل کے سارے چرند پرند انگشت بدنداں تھے۔لیکن کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔''

''لیکن کوئی بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔''

''کیوں کہ سب کو اپنی جان کی پڑی تھی۔کوئی بھی دوسروں کے لئے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔''

''خطرہ۔۔۔اور وہ بھی حقیر لومڑیوں سے۔جن کا سر ہم ایک ہی وار میں دھڑ سے الگ کر سکتے ہیں۔''

''جنگل کے سارے جانور ایک دوسرے کا اعتماد کھو چکے تھے۔اور سبھی جاتیاں ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔''

''لیکن ہمیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح سے کم ظرف لومڑیاں بہادر شیروں کا شکار کر رہی تھیں۔

''کیونکہ حکومت شیروں کے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی اور وہ فرقوں میں بٹ چکے تھے۔''

''شیر کیسے حکومت چھور سکتے ہیں۔یہ ناممکن ہے۔''

یہ ایک بوڑھا کتا تھا جس کے سامنے جنگل کے بہت سارے نونہال اور جوان جانور بیٹھے تھے۔کتا کہانی سنا رہا تھا اور وہ بڑے انہماک سے اس کی کہانی سن کر حیران

ہو رہے تھے۔ان میں سے کچھ جوان جانور بڑی بے یقینی کے ساتھ بوڑھے کتے کو تک رہے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ زیادہ سننے والے تمسخر اڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہے ہیں تو اس نے اپنی سامنے والی ٹانگیں آگے کر دیں، اپنی تھوتھنی پنجوں پر رکھ دی اور آنکھیں موند لیں۔ نونہالوں کے چہروں پر بے چینی رقصاں ہوگئی۔ وہ یہ پوری کہانی سننا چاہتے تھے۔لیکن بوڑھا کتا غصے میں اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا۔نونہال، جوان جانوروں کی ملامت کرنے لگے جو کتے کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ بوڑھے کتے کی منت سماجت کرنے لگے لیکن کتا کچھ نہ بولا۔ پھر جب چھوٹے چھوٹے بچوں نے اسے تنگ کرنا شروع کیا تو اس نے دور بیٹھے جگالی کرتے ہاتھی کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھ سے زیادہ ہاتھی کو پتا ہے۔آگے کی کہانی اسی سے سن لو۔'' جوشوقین تھے انہوں نے ڈھیر ساری گاس اکھٹی کر لی اور ہاتھی کے سامنے ڈال دی اور خود اس کے سامنے بیٹھ کر اسے آگے کی کہانی سنانے کے لئے اسرار کرنے لگے۔ ہاتھی نے ان سے وہاں تک کی کہانی سنی جو انہوں نے کتے سے سنی تھی۔کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے ہاتھی بولا۔

صاف وشفاف پانی سے لبالب مست ندی جنگل کے بیچوں بیچ گذر رہی تھی۔ندی کے دونوں کناروں پر خوبصورت پھولوں سے بھری ڈالیاں تھیں۔شفاف پانی اچھلتا مچلتا کناروں سے ٹکراتا تھا۔اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح اچھل اچھل کر پھولوں کی ڈالیاں تر کر رہے تھے۔ دور دور سے آرہی رنگ برنگی تتلیاں ڈالیوں میں مست مست اٹھکیلیاں کرتی، نرم و نازک پر ہلاتی اور پھولوں کو چھو کر نکل جاتی تھیں۔خرگوش، گلہریاں اور چھوٹے چھوٹے جانور دوڑیں لگا رہے تھے۔ چڑیاں، کوئل، مینا ہر صبح ندی کے کنارے پیڑوں پر بیٹھ کر چہچہا رہی تھیں۔ندی کے پانی کا شور، پرندوں کی چہچہاہٹ، ہوا کی تال پر پھڑ پھڑاتے درختوں کے پتے سماں باندھ دیتے تھے۔ اور سارے ارد گرد کو مہکاتے تھے۔جنگل میں شیر، بھیڑیئے،

لومڑی، ہرن، گائے، بکری، بھیڑ اور دوسرے چرند پرند ایک ساتھ خوشی خوشی رہتے تھے۔اور ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتے تھے۔ بلا وجہ کوئی ہنگامہ کوئی شور شرابا نہیں ہوتا تھا۔کبھی کسی وجہ سے دو گرہوں میں جھگڑا ہو بھی جاتا تھا تو زیادہ دیر تک تناؤ نہیں رہتا تھا۔کوئی نہ کوئی بیچ بچاؤ کرنے آ ہی جاتا تھا۔ کیوں کہ سبھی جانتے تھے کہ بات بادشاہ شیر تک جائے گی تو وہاں معمولی غلطی بھی معاف نہیں کی جاتی تھی۔سارے جنگل میں شیر بادشاہوں کا دبدبہ صدیوں سے قائم تھا۔

اب کی بار جنگل کا راجہ ایک سیکولر شیر بنا۔دراصل شیر شعروشاعری کا شگف رکھتا تھا۔شعر سننا اور شعر کہنا اسے اچھا لگتا تھا۔وہ خونخوار بھی نہیں تھا۔اس کے دل میں اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔بلا وجہ کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔اور نہ ہی کسی کو یہ حق دیتا تھا کہ وہ دوسرے پر ظلم و زیادتی کرے۔راجہ نے آہستہ آہستہ اپنی رعایا کو بہت سارے حقوق منتقل کرنے شروع کر دئے۔بھیڑیئے جو شیر سے ڈرے ڈرے رہتے تھے اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے ، ان کو شیر کی بیٹھک میں بیٹھنے کا موقعہ نصیب ہو رہا تھا۔لومڑیاں جو چالاکی اور مکاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں انہیں کچھ زیادہ ہی اپنے کرتب دکھانے کا موقعہ مل رہا تھا۔ کتے جو ہر زمانے کے وفادار تھے ،آج بھی راجہ کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔لیکن ہرن، گائے، بکری، بھیڑ کے مشکلات کم نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوا۔ان پر کبھی بھی کوئی بھی حملہ آور ہو جاتا تھا۔ پہلے بھی انہیں بے دردی سے کاٹا جاتا تھا۔آج بھی ان کا حال بہتر نہیں تھا۔ وہ صرف شیر کو جنگل کا راجہ مانتے تھے اور اسی کو شکار کھیلنے کا مجاز بھی سمجھتے تھے۔لیکن اب کوئی بھی ان پر حملہ کرتا تھا اور وہ کسی کے سامنے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔اب سبھی مانس کھانے والے جانور ایک ساتھ مل چکے تھے اور وہ ایک ساتھ شکار بھی کرتے تھے۔راجہ کا سیکولر ہونے میں گاس کھانے والے جانوروں کا کوئی فایدہ نہیں ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ جنگل کی حکومت شیر کے خاندان سے پھسلتی چلی گئی۔اب جمہور کا زمانہ تھا۔کوئی بھی راجہ بن سکتا تھا۔۔۔لیکن شیر کے خاندان کی اب بھی سبھی عزت کرتے تھے۔اور ابھی بھی ان کے وفادار بنے تھے۔سیکولر شیر نے جب جنگل کی حکومت چھوڑ دی تھی اس وقت اس نے رقعت آمیز تقریر کی تھی۔اپنی قوم یعنی شیروں کے ظلم کی دہائی دی۔صدیوں سے قائم جنگل پر ان کی زبردستی حکومت کو غیر جمہوری کہا۔جنگل کے سارے واسیوں کو شیر کے پنجوں سے آزادی دلادی۔اب جنگل سارے چرند پرند آزاد تھے اور وہ اب کسی کو بھی اپنا بادشاہ چن سکتے تھے۔لیکن ساتھ ہی تمام جنگل واسیوں کو یہ بھی نصیحت کی تھی کہ وہ چاہئے کتے بھیڑیئے کو جنگل کا راجہ بنادیں، گائے بکری کو حکومت سونپ دیں،لیکن لومڑی کو کبھی بھی اپنا حاکم نہ بنالیں۔۔۔ویسے بھی جنگل کے سارے چرند پرند لومڑیوں کی چترتا اور لالچ سے واقف تھے۔وہ بھی لومڑیوں کی مکاری اور چالاکی کی وجہ سے ان کو حکومت سے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔اور اگرچہ لومڑیوں کو حکومت تو نہیں ملی لیکن یہ ہمیشہ حکومت کے قریب رہتی تھیں۔اور اپنی چالاکی سے ہر راجہ کے مشورے میں شامل بھی رہتی تھیں۔لیکن بڑی خاموشی کے ساتھ پرجا کو بانٹ بھی رہی تھیں۔یہ خود کو شاکاہری ظاہر کرتی تھیں لیکن شوق سے گائے بھینس کا شکار کرتی تھیں اور بڑے پیانے پر مانس اور چمڑے کا کاروبار بھی کرتی تھیں۔جنگل کے گھاس کھانے والے جانور بار بار ان کے جھانسے میں آجاتے تھے۔ لومڑی ہر حال میں جنگل کے چرند پرند کو بانٹنے کا کام پہلے پہل چوری چھپے کرتی تھیں۔اور پھر کھلم کھلا کرنے لگیں۔جب ان میں طاقت آگئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ایک جاتی پر دعویٰ بول دیا جائے۔وہ شیر کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں۔لیکن ان کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔کیونکہ داناؤں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ شیر ابھی ابھی حکومت سے دست بردار ہوئے ہیں۔ابھی راجہ مہاراجاؤں کا تازہ خون ان کی شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔کہیں انہوں نے واپسی

حملہ کیا تو بنا بنایا کھیل پھر سے بگڑ جائے گا۔اس لئے انہوں نے سب سے پہلے کتوں پر حملہ بول دیا۔ایک تو یہ کسی حد تک شریف جانور تھا اور دوسرا اس میں وفاداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔اور ایک بات یہ بھی تھی کہ کتا شیر کے قریب تھا اور اس کا وفادار بھی۔پھر بھیڑوں کی بھاری آئی۔اسی طرح لومڑیوں نے پہلے سارے جنگل کے واسیوں کو الگ الگ بانٹ کر رکھ دیا۔پھر ایک ایک کر کے اپنے بلوائیوں سے ختم کرایا۔کوئی بچا بھی تو وہ دم دبا کر لومڑیوں کی خدمت میں لگ گیا۔اب ان کا ایک ہی طاقتور دشمن بچا تھا اور وہ تھا شیر۔لیکن لومڑیوں کو یہ ڈر ستا رہا تھا کہ کیا پتا کبھی ایک جھٹ ہو گئے، آخر ہیں تو شیر ہی۔حالانکہ شیر بھی بکھر چکے تھے۔حکومت سے بے دخلی کے بعد ان کا اتحاد بھی ٹوٹ چکا تھا۔۔۔اب یہاں بھی لومڑیوں کی گناؤنی چال کامیاب رہی۔انہوں نے شیروں کو بھی آپس میں بانٹنے کا کام شروع کر دیا۔شیر کی ساری جاتیوں کو بانٹنے کے ساتھ ساتھ ان کو رنگ، نسل اور لب و لہجے کے آدھار پر بھی حصے کر دیئے تھے۔ شیروں کی سب سے کمزور جاتی بلی کی مدد کرتے رہے اور ان کو ساری شیر کومنٹی کا امام بنا دیا۔بلیاں آئے روز فتوے جاری کرتی رہتی تھیں۔ببر شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگی تھیں اور انہیں کافر تک کہہ دیتی تھیں۔وہ مذہب اور اخلاق کے پرچار میں شیروں کو ناستک۔چیتا کو دہشت گرد۔اور تیندوے کو لومڑیوں کا دشمن مشتہر کر چکی تھیں۔

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔جب جنگل کے چاروں اور صرف لومڑیوں کے چرچے ہو رہے تھے۔اور سبھی جاتیوں پر ان کا اثر بھی بڑھتا جا رہا تھا۔یہ اکثر جنگل میں کوئی فساد کرواتی تھیں اور الزام شیروں پر لگاتی تھیں۔بلیوں سے ان کے خلاف فتوے جاری کرواتی تھیں۔ایک ایک شیر کو تنہا کر کے، اس کو کسی جرم میں پھنسا کر کسی بھی بہانے اس کا شکار بھی کرواتی تھیں۔لیکن جب انہیں کہیں سے اس بات کی بھنک بھی لگ جاتی تھی کہ شیر متحد ہو رہے ہیں

توان کے ساتھ دوستی کا ناٹک کرتی تھیں۔شیروں کو اعتماد میں لیتی تھیں۔لیکن ان کی پیٹھ پیچھے ان کو گرانے کے لئے گڑھا بھی کھدوا دیتی تھیں۔لومڑیوں اور شیروں کے بیچ یہ آنکھ مچول کا کھیل کئی سال تک چلتا رہا۔لیکن اس دوران جانوروں میں اثر رکھنے والے شیر ختم ہو چکے تھے۔لومڑیوں نے شیروں کا جینا دوبھر بنا دیا تھا۔اور شیر بھی دبتے چلے جا رہے تھے۔شیر لومڑیوں سے دور کونوں کھدروں میں چھپ رہے تھے۔کچھ دوسرے جنگلوں کا رخ کر رہے تھے۔

شیروں کو دبانے اور ان کے اتحاد کو تار تار کر کے بکھرا دینے کے بعد جنگل پر اب صرف لومڑیوں کا راج تھا۔اب جنگل میں جو کھیل شروع ہوا تھا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ لومڑیاں جب حکومت میں آ گئیں تو راج پاٹھ چلانے کے سارے گن بھی سیکھ چکی تھیں۔ باقی دنیا میں مانس اور چمڑے کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں اس لئے لومڑیوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ گائے، ہرن، بکری، بھیڑ کا سفایا کرنا شروع کر دیا۔اور ان کا مانس، چمڑہ یہاں تک کہ ان کی ہڈیاں تک بازاروں میں بھیجنی شروع کر دی۔جنگل کی ساری جاتیوں کو بکھرا کر رکھ دیا۔راج پاٹ میں شامل لومڑیاں اب پرجا میں پھنسی لومڑیوں کی جان کی دشمن بن گئی۔ان پر پچھڑی ذات، نیچ، چمار اور چنڈال کے لیبل چسپاں کر دئے اور ان پر یہ پابندیاں لگا دی کہ نہ وہ راج محل میں آ سکتی ہیں اور نہ ان کو کسی عبادت گھر میں آنے جانے کی اجازت ہوگی۔۔۔

ہاتھی سانس لینے کے لئے رک گیا تو ننھے منے جانور بے چین ہو گئے۔وہ پہلو بدلنے لگے۔لیکن ان کی نظریں ابھی تک ہاتھی کے چہرے پر ہی لگی تھیں۔ان میں سے ایک ننھے جانور نے بڑی معصومیت سے ہاتھی سے پوچھا۔

''اور شیر۔۔۔شیر کیا ہوئے۔؟''

''شیر۔۔۔'' ہاتھی نے آہ بھرتے ہو کہا۔

جنگل کے چرند پرند ، دلت لومڑیاں۔بچے کھچے بھیڑیئے، کتے ، گائے ہرن صدیوں سے دعا مانگ رہے ہیں کہ جنگل میں پھر وہی زمانہ لوٹ آئے۔شیر پھر سے جنگل کا راجہ بن جائے۔لیکن شیر۔۔۔وہ تو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور آپس میں کافر کافر کھیل کھیل رہے ہیں۔

☆☆☆

بزدل

''یہ محبت کا جنون ہے فرہاد۔۔۔ میری محبت کا جنون ۔ایسی محبت تمہیں کسی اور سے کہاں ملے گی۔۔۔کون ہے جو اس طرح سے تمہارا راستہ روکے۔۔۔تمہارا اہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سر راہ اتنا کچھ سوچے کہ بات سوچ کی انتہا تک جا پہنچے۔۔۔اور وہ کر گزرے کہ سوچ بھی محوِ سوچ ہو کر سوچتی رہ جائے۔''

''ایسی محبت ہمارے یہاں نہیں پنپ سکتی شیریں۔۔۔ایسے جنون کی سزا بہت بھیانک ہے یہاں۔''

شیریں سوچ کی وادی سے ہڑ بڑا کر باہر نکلی۔ یہ دل دہلا دینے والی آدھی چیخ کسی عورت کی تھی پھر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔شاید عورت کا منہ سختی کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا اور باقی آدھی چیخ اس کے گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔شیریں نے آہستہ سے کھڑکی کے پٹ پر دباؤ ڈالا۔ چھوٹی سی جھری بنا کر باہر دیکھا تو اس کے حواس اڑ گئے۔ چار آدمی کسی کی لاش اٹھائے اسیری کے آنگن میں پہنچ چکے تھے۔اسیری جابر کی مضبوط بانہوں میں تڑپ رہی تھی۔ جابر کا ہاتھ اسیری کا منہ سختی سے بند کئے ہوئے تھا اور زبان سے اسیری کو خاموش رہنے کی تنبیہ بھی کر رہا تھا۔ان کا چھوٹا بیٹا امن جو ابھی صرف تیرہ سال کا تھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے باپ کی بانہوں میں تڑپ رہی تھی۔جھول رہی تھی۔

اس اداس بستی میں برسوں سے چلی آرہی سوگوار ہوا کی ہلکی جنبش سے لاش کے چہرے پر پڑا کپڑا پھڑ پھڑایا تو شیریں نے لاش پہچان لی۔ یہ فرہاد تھا۔جابر اور اسیری کا جوان اور خوبرو بیٹا جو کسی دشمن کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔فرہاد جس کو ابھی مرنا نہیں چاہئے تھا۔۔۔

شیریں دہاڑیں مار مار کر رونا چاہتی تھی۔اسے فرہاد بہت اچھا لگتا تھا۔اسے دیکھ دیکھ کر شیریں کے دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ کبھی شام کے ملگجے میں موقع ملے تو فرہاد کے گھنگریالے بال پیچھے سے کھینچے اوروہ پیچھے مڑ کراسے جی بھر کر دیکھ لے۔۔۔ شیریں کے ابھرتے خدوخال چھولے۔۔۔اس کی آنکھوں میں تیرتے مدوجزر میں ڈوب جائے۔۔۔اگر موقع مل جائے تو اس کے سرخ سرخ ہونٹوں کو ایک بار چکھ کر دیکھے۔۔۔ اور موقع مل جائے تو اس کا بازو کھینچ کر رات کے اندھیرے میں گم ہوجائے۔۔۔وہ فرہاد سے پیار کا ایک بھر پور لمس چاہتی تھی۔۔۔مست مدہوش کر دینے والا ایک لمحہ ۔۔۔ایک لمحہ جو ایک صدی پر بھاری لگے۔۔۔

پھر چاہے اگلی صبح کچھ بھی ہوجائے۔۔۔بستی کے رواج کے مطابق گردن تک زمیں میں دھنسا دی جائے۔۔۔ یا پتھروں سے اس کا سر پھوڑا جائے۔۔۔۔

شیریں کا باپ آزار بھی جابر کے آنگن میں پہنچ چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ پورا گاؤں آنگن میں جمع ہورہا تھا۔سبھی کے چہروں پر سکون تھا۔کوئی چہرہ اداس نہ تھا۔ چیخنے چلانے والی اسیری دم گھٹنے سے کب کی بے ہوش ہوچکی تھی اور محلے کی عورتیں اسے اٹھا کر گھر کے اندر لے گئی تھیں۔کہیں سے بھی بین کرنے یا رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔یہاں کسی بچے، جوان یا بوڑھے کی موت ہوجاتی تو کوئی غم ،سوگ نہیں منا تا۔موت ان کے لئے کوئی بڑا سانحہ نہیں تھی۔یہ تو ان کی روزمرہ کی زندگی تھی۔لڑائی ہوئی کسی کو مار دیا یا ان کا کوئی مارا گیا۔ آخری رسومات ہوئے تو بات ختم۔کوئی واویلا نہیں،کوئی ماتم نہیں۔یہاں عورتوں کے رونے دھونے پر بھی قدغن لگی تھی۔

فرہاد کی لاش بھی خاموش زمین پر پڑی تھی۔بس مردوں کی باتیں کرنے سے ماحول میں کشیدگی پھیل رہی تھی۔فرہاد کی موت پر سارا گاؤں امڈ آیا تھا۔بچے جوان بوڑھے سب کے

ہاتھوں میں رنگ برنگے جھنڈے تھے۔ سارا آنگن ان رنگ برنگے جھنڈوں سے رنگین لگ رہا تھا۔ وہ جھنڈے لہراتے لہراتے اور نعروں کی گونج میں فرہاد کی لاش کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ جب بھی کوئی مارا جاتا تھا یہ لوگ ہاتھوں میں رنگ برنگے جھنڈے لے کر نعرے لگاتے لگاتے اس کا جلوس نکالتے تھے۔۔۔ لوگ فرہاد کی لاش لے کر جا رہے تھے تو جابر نے گھر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اس کا اپنا چھوٹا بیٹا امن گھر کی ایک ٹوٹی دیوار کے ساتھ خوف زدہ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی رنگین جھنڈا ابھی نہیں تھا۔ ایک بار امن کے ہاتھ میں سفید جھنڈا دیکھ کر جابر نے اس کا ہاتھ توڑ دیا تھا جو سال بھر کے بعد ٹھیک تو ہوا پر کمزور رہا۔ تب سے امن ہر کام اپنے بائیں ہاتھ سے ہی کرتا تھا۔ امن نعرے لگا رہے لوگوں کو سہما سہما دیکھ رہا تھا۔ جب سارے لوگ چلے گئے تو گاؤں میں مرد نام کا بس ایک امن کھڑا تھا۔۔۔ شیریں گھر سے باہر آئی اور تیر کی طرح فرہاد کے گھر میں گھس گئی جہاں عورتوں کی بھاری بھیڑ جمع تھی۔ سب کے چہرے اداس تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں سے ساون برسنے کو تیار تھا۔ پر کس کی مجال جو دھاڑیں مار کر رو لے۔ اسیری ابھی بھی بے ہوش پڑی تھی۔ اور عورتیں حسرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ مٹھی بھر لوگ دنیا بھر کے سارے انسانوں کو بانٹنے کے لئے پانی کی طرح پیسہ بہا رہے تھے۔۔۔ قوموں کو الگ کرنے کے منتر پھونکے جا رہے تھے۔۔۔ اپنے اپنے مذاہب کو بچانے کے فرائض کی پٹی پڑھائی جا رہی تھی۔۔۔ جان دینے اور جان لینے میں کتنے پُن ہیں، ثواب ہیں۔ سمجھایا جا رہا تھا۔۔۔

جابر، آزار اور ان کے جیسے کئی لالچی لوگ بڑی آسانی سے ان کے دام میں آ چکے تھے۔ اب یہ بھی اپنے خوبصورت علاقوں میں نفرت کے نام پر موت بانٹ رہے تھے۔ ابھی ان کی سوچ میں بدلاؤ آیا ہی تھا کہ پیسے کے ساتھ ساتھ ہتھیار بھی یہاں پہنچ گئے۔ بستی اتنی

بڑی نہیں تھی جتنا ان کے مرنے مارنے کا ساز وسامان آپہنچا تھا۔جس نے کندھے پر بندوق اٹھائی اسے اپنا کاندھا سب سے زیادہ مضبوط لگا۔جس نے پیٹھ پر گولیوں کی بلٹ باندھی اسے اپنا سینہ اور چوڑا ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔سب خود کو طاقت ور اور دوسروں کو کمزور جاننے لگے۔ کل تک جن لوگوں کے دل بجلی کڑ کنے سے دہل جاتے تھے۔ وہ آج بم دھماکوں سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔کل جنہیں کتے کی زخمی ٹانگ سے رستا خون دیکھ کر غش آجاتا تھا۔آج وہ خون میں لت پت بیٹوں کی لاشیں اٹھانے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔لگتا تھا سب لوگوں کا کسی بڑے اسپتال میں آپریشن ہوا ہے۔ان کے سینوں سے دل نکال دیئے گئے ہوں اور وہاں دل کے بدلے پتھر رکھ دیئے گئے ہوں۔جبھی تو انہیں ماؤں کے ہونٹوں پر تڑپتی آہ وزاری اور آنکھوں میں تیرتے آنسوں کے سمندر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ان کے دل نہیں پسیجتے تھے۔اب برسوں سے یہ اپنے ہاتھوں سے اپنوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے۔انہیں دفنا کر آنے کے بعد پھر سے اپنے ہنگاموں میں گم ہو جاتے تھے۔

آج پھر کئی دنوں سے لڑائی جاری تھی۔بستی پر بم اتنی شدت سے گرائے جا رہے تھے کہ لوگوں کو لاشیں اٹھانے کی بھی مہلت نہیں مل رہی تھی اور لاشوں کی تعداد تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔تین دن سے لگاتار لڑائی جاری تھی۔ یہاں سے بھی دشمن کی بستیوں پر بم برسائے جا رہے تھے اور سامنے والوں کو بندوقوں سے بھون دیا جا رہا تھا۔بستی کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔لڑائی ختم ہونے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔اب ڈر تھا کہ لاشوں سے تعفن اٹھنے لگا تو بستی میں رکنا محال ہو جائے گا لیکن بستی چھوڑ کر کہیں اور جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔بستی کے ارد گرد جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان میں جو قدرتی اور مصنوعی غار بنے تھے۔لوگ ان میں دبکے بیٹھے تھے۔کئی غار تباہ بھی ہو چکے تھے اور ملبے کے ڈھیروں تلے پتا نہیں کتنے لوگ دب چکے تھے۔ان میں مرے کتنے اور زخمی کتنے تھے کوئی بتا نہیں سکتا تھا۔اوپر

سے لگا تار بم گرائے جا رہے تھے۔ اب کوئی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ کل صبح تک یہاں کوئی زندہ بھی بچے گا۔

ابھی شام نے اپنا سرمئی آنچل نہیں پھیلایا تھا کہ اچانک گولا باری رک گئی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تو فضا اب بھی خاموش تھی۔ اچانک کہیں سے پرندوں کی آوازیں آنے لگی۔ شاید آسمان سے پرندوں کا کوئی جھنڈ جا رہا تھا۔ پرندوں کا یہ شور کئی دنوں کے بعد سنائی دیا تھا اور سب لوگوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ رات نے بستی کے اوپر اپنی کالی چادر تان لی لیکن فضا اب بھی خاموش تھی۔

''امن ۔۔۔ امن ۔۔۔ امن ۔۔۔'' اچانک کہیں سے خاموشی کا سینہ چیرتے ہوئے اسیری کی آواز آئی جو اپنے بیٹے امن کو پکار رہی تھی۔ پھر کہیں سے شیریں بھی نکل آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی عورتیں، مرد اور بچے ڈرتے ڈرتے غاروں سے باہر نکل آئے۔

پھر لوگوں کا شور و غوغا، جس سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ جس میں اسیری کی آواز دب کر رہ گئی۔ کوئی ڈرتے ڈرتے کہیں سے جلتی مشعل اٹھا لایا پھر کیا تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں روشنی تھی اور بندوقیں، بم، اسلحہ کہیں دور پڑے تھے۔ سبھی اپنوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لاشیں نکال رہے تھے اور انہیں دفنا رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں، بھائیوں اور شوہروں کی لاشوں پر بین کر رہی تھیں۔ آج کوئی بھی اپنی بیوی یا بیٹی کا منہ بند نہیں کر رہا تھا۔ اسیری کو اپنے شوہر جابر کی اور شیریں کو اپنے باپ آزار کی لاش ملی۔ سب کو اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا۔ پو پھٹنے سے پہلے تک کم ہی لاشیں بچی تھیں جو دفنانا باقی تھیں۔ سب تھکے تھکے سے تھے لیکن اس دوران سب ہی کے من میں ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا کہ آخر یہ جنگ، یہ خون خرابہ رکا تو رکا کیسے۔

اس افراتفری میں پھر اسیری کی درد بھری آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ وہ

امن امن پکار رہی تھی جیسے اسے امید تھی کہ صبح کی روشنی میں امن اسے ضرور ملے گا۔صبح صادق کی پہلی روشنی میں لوگوں نے اپنی بستی کو غور سے دیکھا تو ساری بستی اجڑ چکی تھی۔گھر زمین بوس ہو چکے تھے۔جگہ جگہ ہتھیار الٹے سیدھے پڑے تھے۔سارے رنگ برنگے جھنڈے سرنگوں تھے۔اچانک شیریں نے ایک چھوٹی سی پہاڑی کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گئی۔وہ سب کو اس طرف اشارہ کرنے لگی۔جہاں سے سورج کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور صبح کی مست مست ہوا کی تال پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔سفید جھنڈا امن کے مضبوط والے ہاتھ میں لہرا رہا تھا اور وہ نمناک آنکھوں سے اپنی ویران بستی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔سب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔۔۔اچانک۔۔۔اس مسرت بھری بھیڑ میں۔۔۔کہیں سے نحیف سی لیکن نفرت انگیز آواز ابھری۔۔۔ بزدل

☆☆☆

صرف اٹھارہ سال

حلیمہ جب چھوٹی تھی ۔ ماں کے ہر کام میں ہاتھ بٹانا اس کا معمول تھا۔ تینوں بھائی بہن ماں کے دلارے تھے اور ہر شام ماں کے ساتھ چپکے بیٹھے رہنے کے عادی بھی ۔ برفیلے موسم میں ماں دن بھر کے سارے کام نپٹا کر جب شام کو چرخہ کا تنا شروع کرتی تھی تو بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر انہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی ۔ باہر کڑا کے کی سردی۔ اندر کمرے میں دیئے کی ٹمٹماتی روشنی ۔ اور ماں چولہے سے دہکتے انگارے نکال نکال کر ٹھنڈے کوئلوں کے ساتھ ''سماوار'' میں ڈالتی ۔ سماوار حلیمہ کے سامنے رکھتی جو پھونکیں مار مار کر کوئلوں کو انگارہ بنا دیتی ۔ سماوار میں نون چائے ابلنے لگتی ۔۔۔ کبھی کبھی شوق میں نون چائے کے بدلے قہوہ بنا لیتے ۔۔۔ اور قہوا بنتا یا نون چائے ، اس کے ساتھ مکئی کا ستو لازم ملزوم تھا۔ ستو کے بغیر چائے قہوے کا مزا کہاں ۔۔۔

باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی ۔ ماں چرخے پر بیٹھ چکی تھی ۔ تکلے کی چمڑی میں انگلیوں سے تھوڑا سا سرسوں کا تیل لگایا۔ ایک ہاتھ سے پہیئے کی ہتھی کو گھمانا شروع کیا۔ تکلا بنا آواز کئے آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ اب اس نے دوسرے ہاتھ میں پونی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو گھومتے ہوئے تکلے کی نوک کے ساتھ لگایا اور پونی کو ہلکی رفتار کے ساتھ بل کھاتے تکلے سے دُور لے کر گئی ۔ تا کہ دھاگا ٹوٹنے نا پائے اور بل کھانے سے سُوت بھی بنتا جائے ۔ مناسب دوری پر ہاتھ لے جا کر پہیہ روک کر پونی سے بٹے ہوئے سوُت کو تکلے پر لپیٹ دیا اور تند ڈالنے کا یہ عمل بار بار دہرانے لگی ۔ باپ نے دروازہ کھڑکیاں بند کر لیں ۔ چھوٹی حلیمہ نے اسے کانگڑی دی ۔ مکئی کا ستو ڈالا گرما گرم قہوے کا پیالہ سامنے رکھ دیا اور خود بہن بھائی کو

پھلانگ کر ماں کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی ۔ ماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہانی کو آگے بڑھایا۔

وقت کب دبے پاؤں گزر گیا پتہ ہی نا چلا۔حلیمہ بڑی ہوگئی پھر پیا کے گھر چلی گئی ۔ ماں سے سنی درجنوں کہانیوں میں ایک جوگی کی کہانی تھی جو حلیمہ کے ذہن کے سکرین پر جیسے فریز ہوکر رہ گئی تھی ۔ یہ کہانی اس کے دل اور اس کی روح پر اندیشوں اور وسوسوں کے ہتھوڑے برساتی رہتی تھی ۔ڈر اور خوف اسکے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتے ۔ وہ اکثر بات کرتے کرتے کھو جاتی ۔ جیسے ماں کے چہرے کو تشویش سے تکتی جارہی اور ماں اسے بے نیاز کہانی سناتی جارہی ہے۔

''ان کی شادی کو بارہ سال ہو گئے تھے۔لیکن ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی ۔ وہ حکیموں اور ویدوں کے پاس گئے ۔تعویذ گنڈے کئے ۔ٹونے ٹوٹکے آزمائے ۔ پر بچہ نہ ہوا۔ وہ خیرات کرتے رہے ۔صوفی سنتوں کو کھانا کھلاتے رہے ۔ پیروں فقیروں کے در کھٹکھٹائے ۔ پر ان کے نصیبوں کے در وا نہ ہوئے ۔ پھر ایک دن ان کے آنگن میں ایک جوگی آ گیا۔

جوگی کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ جیسے اس کی آنکھوں میں خون کا سمندر موجزن تھا۔انہوں نے جوگی کی بڑی منت سماجت کی ۔تب جا کر جوگی کا دل پسیجا۔ ''

''میں بچہ تو دوں گا لیکن یہ بچہ صرف اٹھارہ سال تم لوگوں کے پاس رہے گا۔اٹھارہ سال کے بعد بچہ مجھے واپس کرنا ہوگا۔''

پہلے تو ان کی زبانیں لڑکھڑا گئیں ۔لیکن جب جوگی غصہ ہوگیا۔تو انہوں نے جلدی میں اٹھارہ سال کو ایک صدی کا سکھ جان کر اقرار کرلیا۔ جوگی نے ان سے وعدہ لیا اور کنول کا ایک پھول دے کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔''

شادی کا پہلا سال حلیمہ کی زندگی کا پر سکون سال گذرا ۔ پھر دو سال تک دن اور

شام کا کھانا اس نے آنسوں میں بھگو بھگو کر کھایا۔ساس کے طعنوں اور شوہر کی بے رخی نے اس کی رس بھری زندگی میں زہر بھر دیا۔ڈاکٹر ،اسپتال،کلنک ،لبارٹریاں سب اس نے چھان ماریں لیکن اس کی کوکھ خالی کی خالی ہی رہی۔وہ تو بھلا ہو گل رخ کا جس نے اسے بتایا کہ وہ ''بابارشی'' کے دربار میں حاضری دے کر آئے۔جو وہاں جاتا ہے،جھولی بھر کے واپس آجاتا ہے۔گل رخ حلیمہ کی بچپن کی سہیلی جو شادی کے کئی سال بعد اسے ملی تھی۔حلیمہ نے بڑی مشکل سے اپنے شوہر کو منالیا اور اسے ساتھ لے کر بابا رشی کی درگاہ پہنچ گئی۔یہاں اس جیسی کئی شادی شدہ لڑکیاں آئی ہوئی تھیں جن کی جوانی کو گہن لگ چکا تھا۔ان کے شوہر ان سے نالاں تھے اور ساسیں ان کی زندگی اجیرن بنائے ہوئی تھیں۔کئیں تو خودکشی کرنے پہ مجبور تھیں۔کئیں ایسی تھیں جنہیں شوہر طلاق کے نام پر دھمکا رہے تھے۔یہ سب بڑی امیدیں لے کر یہاں آئی ہوئی تھیں۔بابارشی کی یہ درگاہ ان سبھی مرجھائے جسموں میں تازگی اور آنسو بھری آنکھوں میں رمق بخشنے کا آخری سہارا تھی۔حلیمہ نے بھی اپنی باری پر درگاہ کے چولہے کی لپائی کی۔روتے روتے بچے کی بھیک مانگتی رہی۔مٹی میں پانی سے زیادہ اس کے آنسو مل رہے تھے جن سے درگاہ کا چولہا تر ہوتا جا رہا تھا۔

ہوا میں شامل شام کی ہلکی سی خنکی بھرا خیال حلیمہ کو پھر ماں کے پہلو میں لے کر آ گیا۔۔۔ ماں کی کہانی کا سلسلہ پھر جڑ گیا تھا۔۔۔۔ کہ چرخے کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ ماں چرخے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ دھاگا ٹھیک کرنے لگی۔ بچے بے چین ہو گئے۔ وہ سارے سانس روکے ماں کو تک رہے تھے۔حلیمہ کا باپ تڑپ اٹھا۔شاید وہ بھی کان لگا کر کہانی سن رہا تھا۔اس نے جلدی سے کہا۔

''حلیمہ کی ماں۔۔۔۔پھر کیا ہوا۔کیا ان کا بچہ ہو گیا؟'' حلیمہ کی ماں کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔اس نے شوخ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

اب تو حلیمہ ڈیڑھ سالہ عامر کی ماں تھی اور ماں سے سنی وہ جوگی والی کہانی سنے بھی سال ہا بیت چکے تھے۔لیکن وہ اس کے ذہن ودل میں کچھ اس طرح سے بیٹھ چکی تھی کہ ہزار بار ذہن جھٹکنے کے باوجود بھی اسے اپنے وجود سے الگ نہ کر پاتی تھی۔۔۔

حلیمہ کے آنگن میں عامر کے ساتھ ساتھ ایک چنار کا پودا بھی پنپ رہا تھا۔حلیمہ نے چھوٹے چنار کا تنا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔وہ ہر روز دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اور انگلیاں ملا کر اس کی موٹائی ناپتی رہتی تھی۔عامر دوڑ کر آیا اور چنار کے ساتھ لپٹ گیا۔چھوٹا سا چنار اوپر تک ہل کر رہ گیا۔حلیمہ نے عامر کو اپنے بازو کے حلقے میں لے کر سینے سے لگایا۔ دائیں گال پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ چنار کا چھوٹا سا پودا تیرے ساتھ ساتھ بڑا ہو جائے گا۔ بڑا ہو کر جب یہ تناور درخت بن جائے گا۔یہ ہمیں چھاؤں دے گا۔میں اس کی موٹی شاخ سے رسی باندھ دوں گی۔تم اور تمہارے بچے اس پر جھولا جھولیں گے۔''

ننھا عامر ماں کی بات سے بے نیاز چنار کے پتے کو انگلیوں سے مسل رہا تھا۔

لیکن بڑا ہوتے ہی عامر چنار سے دور ہو گیا۔اسے چنار کی چھاؤں راس نہ آئی۔وہ خار دار راہوں کا مسافر ہو گیا۔ اس نے اپنے لئے تپتا صحرہ چنا اور دھوپ کا مکین ہو گیا۔یہاں ہوا ہی کچھ ایسی چلی تھی کہ بچے جوان ہونے سے پہلے ہی قتل گاہ پہنچا دیئے جاتے تھے۔ماں باپ بچوں کے جوان ہونے سے خوف زدہ تھے۔وہ چاہتے تھے ان کے بیٹے ہمیشہ بچہ بنے رہیں۔جوانی کی دہلیز خون کی لکیر لگ رہی تھی۔بڑی مشکل سے بچے اسے پار کر پاتے تھے۔کالج میں قدم رکھتے ہی عامر بھی حالات کے ہتھے چڑھ گیا۔اور ایک دن فجر سے پہلے ہی وہ گھر سے بھاگ نکلا۔پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آیا۔اس کے جاتے ہی گھر عتاب کا شکار ہو گیا۔اس کی تلاش میں ہر روز کوئی نہ کوئی آنے لگا اور ایک دن اس کی تلاش میں آئے وردی

پوشوں پر مشتعل نوجوانوں نے پتھراؤ کیا تو اس کا باپ وردی پوشوں کے غصے کے ہتھے چڑھ گیا۔

ماہ وسال بدلے ۔۔۔ گاؤں کے حال احوال بدلے ۔۔۔ حلیمہ کے خدوخال بدلے ۔۔۔ بہت بار چنار کے پتے جھڑ گئے اور نئی کونپلیں پھوٹ آئیں۔اس کے بازوں کے حلقے ترستے رہے۔اب تو چنار بھی اس کی باہوں میں سمانہیں پاتا تھا۔دیر تک کھڑا رہنے اور راستہ تکتے رہنے کی اب اس میں سکت بھی نہیں تھی۔لیکن وہ پھر بھی روز گاؤں سے نکل کر یہاں بہت دیر تک کھڑی رہتی تھی۔راستہ تکتے تکتے اس کی نظریں تھک جاتی تھیں۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے تھے۔شہر سے گاؤں کی طرف آتی پگڈنڈی اسے دھندلی دھندلی نظر آنے لگتی۔ تو وہ ٹوٹے قدموں کے ساتھ گھر لوٹ آتی۔چنار کے پیڑ کے ساتھ لپٹ جاتی۔زارزار روتی اور رو رو کر چنار کو اپنے دل کا درد سناتی۔

''کیا کسی کا ایک دن ایک صدی کے برابر ہوتا ہے؟''

چنار کے تنے سے چہرہ مس کرتے ہوئے وہ درد بھرے لہجے میں بولتی اور خود ہی جواب بھی دیتی۔

''ہوتا ہے۔جس کا دنوں،مہینوں اور برسوں کا حساب گڈمڈ ہو جاتا ہے۔۔۔ جو راستہ تکتی رہتی ہے۔۔۔لیکن راہ گزر سے راہ گیر نہیں آتا۔''

وہ آج صبح بھی چنار کے ساتھ لپٹی، برستی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی اور یہ چھوٹی سی دعا مانگ رہی تھی۔

''میرے مولا۔۔۔ میرا بیٹا لوٹا دے۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے موت دے دے ۔۔۔۔ میں نے سنا ہے۔۔۔ بیٹے تب شہر سے گاؤں لوٹ آتے ہیں۔جب مائیں مرجاتی ہیں۔۔۔۔''

لیکن دعا کے ساتھ ساتھ ماں سے سنی جوگی کی کہانی اور اس کے باپ کا سوال بار بار اس کی سماعت سے ٹکراتا تھا۔

''حلیمہ کی ماں ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔ کیا ان کا بچہ ہو گیا؟'' حلیمہ کی ماں کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں ہو جاتی۔ وہ شوخ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہتی۔

''ہاں ۔۔۔ لیکن جوگی نے کہا تھا صرف اٹھارہ سال۔''

☆☆☆

بند کھڑکی کا کرب

میری بے چینی بے سبب نہیں تھی۔ ذہن و دل میں ایسا طلاطم بپا تھا جو مجھے ایک پل بھی سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنی کھڑکی سے سامنے والے گھر کی تیسری کھڑکی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ یہ پچھلے پانچ دن سے لگا تار بند پڑی تھی۔ حالات کتنے بھی خراب ہو جاتے، تناؤ کتنا بھی بڑھ جاتا، پر یہ کھڑکی دیر سویر کھل ہی جاتی تھی اور ایک گھنگریالے بالوں والا لڑکا کھڑکی سے باہر جھانکتا رہتا تھا۔ وہ سبز خط چہرا، وہ آنکھوں میں بلا کی مقناطیسی کشش رکھنے والا من موہک جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ جان لیوا مسکراہٹ سجی رہتی تھی، اس کا سراپا ''کامہ دیو'' سے بھی زیادہ پُرکشش اور پُرفتنہ تھا۔۔۔اور سب سے بڑی بات۔۔۔۔۔۔۔!

پانچ دن پہلے اچانک کرفیو کا اعلان ہوا تھا۔ پولیس کی گشت بڑھا دی گئی تھی۔ ہر گلی کوچہ فوجیوں کے بھاری جوتوں کی گونج سے لرز رہا تھا۔لوگ گھروں کے اندر دبک کے بیٹھ گئے تھے اور میں کھڑکی کے شیشوں سے سامنے والی تیسری کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتی رہتی تھی۔۔۔ جو بند تھی۔۔۔اب جو کرفیو میں ڈھیل دے دی گئی اور پھر پوری طرح سے کرفیو ہٹا بھی دیا گیا تھا مگر سامنے والی کھڑکی ابھی بھی بند پڑی تھی۔۔۔اور میری بے چینی، بے قراری بڑتی ہی جا رہی تھی۔۔۔

سامنے والا گھر ہمارے پڑوسی رحمان چاچا کا تھا۔اس گھر کے کرایہ داروں سے اگر چہ ہمارا کچھ لینا دینا نہیں ہوتا تھا لیکن چند مہینے سے رہ رہے ایک کرایہ دار سے میرا لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اور کون رہتا تھا یہ مجھے نہیں معلوم۔لڑکا شاید پڑھتا بھی نہیں تھا کیونکہ میں نے کبھی بھی اس کے ہاتھ میں قلم یا کتاب ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ یا شاید یہ

کوئی کام دھندا کرتا تھا جو یہ دن میں نہیں دِکھتا تھا۔بس صبح شام ہی کھڑکی پر نظر آتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ میری نظر اس کھڑکی کی طرف گئی تو تب وہ وہاں کھڑا تھا اور ارد گرد کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا پُرکشش تھا کہ میں بار بار کھڑکی پر آرہی تھی ، جارہی تھی ---۔ پھر ایک بار ہماری نظروں کا تصادم ہوا۔اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ جو ہوا میں ہچکولے کھاتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹکرا کر سیدھے دل میں اُتر گئی تھی۔اس مسکراہٹ کا لمس میرے انگ انگ میں پھیل گیا تھا۔اب آنکھوں کو اس کے سوا کچھ اور دیکھنے کی چاہ نہیں رہی تھی اور دل کو اسے دیکھے بنا قرار نہیں آتا تھا۔میری کچی عمر کی محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہی تھی ۔جب تک کھڑکی بند رہتی تھی ، میرا صبر وقرار چھن جاتا تھا۔ میرے دل میں ہزاروسوسے جنم لیتے تھے۔پھر یہ انجانہ رشتہ طول پکڑتا گیا۔ہم دونوں اپنی اپنی کھڑکی پر آجاتے تھے۔ وہ اپنی معصوم مسکراہٹ میری طرف اچھال دیتا تھا اور میں دو دو ہاتھوں سے اس بکھری مسکراہٹ کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیتی تھی۔ اسی طرح وہ میری مسکراہٹ کو اپنے سینے سے لگانے کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا دیتا تھا۔اور میں ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا اور شاید وہ بھی میرے نام سے نا آشنا تھا۔ ہمارا پیار ابھی بس اشاروں ، کنائیوں تک ہی محدود تھا۔ابھی عہد و پیاں باندھنے تھے۔ جینے مرنے کی قسمیں کھانی تھیں۔اور جنم جنم تک ساتھ نبھانے کے وعدے کرنے باقی تھے--

میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ میں پانچ دن سے اُسے دیکھے بنا جئے جارہی تھی۔ یہ بند کھڑکی شاید میری جان ہی لے لے گی ---جب ذہن ودل میں آندھیاں چل رہی ہوں---آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آرہا ہو اور منزل سامنے ہو کر بھی ہزاروں میل دور لگے تو کچھ اہم فیصلے لینا ایک انسان کے لئے ناگزیر بن جاتا ہے۔ یہ صورت حال ہزارہا

سماجی پابندیوں کے باوجود سماج سے بغاوت کرنے پراکساتی ہے۔میرا بھی ایسا ہی کچھ ارادہ تھا۔میں نے سر پر برقعہ ڈال دیا اور گھر سے باہر آ گئی۔

یہ تیسری کھڑکی رحمان چاچا کے گھر کی پچھلی طرف والی کھڑکی تھی۔گھر کے سامنے آنے کے لئے مجھے ایک لمبا چکر کاٹنا تھا۔اس کے لئے مجھے کئی گھر چھوڑ کرایک دوسری گلی سے گزرنا تھا۔میں گھر کی سامنے والی گلی میں پہنچ گئی جہاں رحمان چاچا کی کان پراب نان بائی بیٹھتا تھا۔اس وقت دکان پراس کی موٹی بیوی بیٹھی تھی۔باقی گلی سنسان ہی تھی۔اکا دکا لوگ ہی گذر رہے تھے۔میں نے گلی کے ایک دو چکر کاٹے تو مجھے لگا نان بائی کی بیوی مجھے گھورنے لگی ہے۔میں نے واپس آنا ہی مناسب جانا۔۔۔

اب یہ میرا روز کا معمول بن چکا تھا۔میں صبح وشام کئی باراس بند کھڑکی کی طرف ضرور دیکھتی تھی۔پہلی اور دوسری کھڑکی میں لگا تار چہرے بدلتے رہتے تھے۔پر یہ کھڑکی اس کے بعد کبھی نہیں کھلی تھی یا شاید پھراس کمرے میں کوئی نیا کرایہ دار آیا ہی نہیں تھا۔

میں نے ہائیر سکنڈری کا امتحان پاس کیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔پھر کالج کو خیر باد کہہ کے یونیورسٹی میں آ گئی ۔ یہاں تک آتے آتے زندگی کا مفہوم ہی بدل چکا تھا۔یہاں آئے دن سمینارز ہوتے تھے۔ڈبیٹس اور ڈسکشنز ہوتے تھے۔جلسے جلوس ،میٹنگز ۔غرض زندگی ایک ہنگامہ بن کر رہ گئی تھی۔آج یونیورسٹی میں ہیومن رائیٹس ڈے تھا۔نیشنل اور انٹرنیشنل لیول کے مندوبین آئے تھے۔سیمنار میں میرا بھی مضمون شامل تھا۔میں نے مضمون پڑھا اور بہت ساری داد بھی وصول کر لی۔سیمنار کا اختتام ہوگیا اور مہمان ہال سے باہر آرہے تھے۔ہال کے دروازے کے باہر سینکڑوں عورتیں ہاتھوں میں بینر اور فوٹو لئے احتجاج کر رہی تھیں۔یہ وہ مائیں اور بیٹیاں تھیں جن کے نوخیز بیٹے،جوان بھائی اور کماؤ شوہر پچھلے کئی برسوں سے لاپتہ تھے۔جنہیں گھروں سے تو اٹھایا گیا لیکن معلوم نہیں کہ انہیں مارا گیا ہے یا وہ

غاصبوں کے تعذیب خانوں میں موت وحیات کی کشمکش میں جی رہے ہیں ۔ بے بس عورتیں چلا رہی تھیں ۔نعرے بلند کر رہی تھیں ۔ کچھ کی آنکھیں نم تھیں اور کئیوں کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے ۔ میں بھی مندو بین کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور ان لاچاروں کی آہ وبکاہ سے کانپ رہی تھی ۔ میری نظر ایک بوڑھی عورت کی طرف گئی جس کی آنکھیں خشک تھیں اور ہونٹوں پر یاس اور ناامیدی کی کایا جم چکی تھی ۔ وہ کمزور ہاتھوں سے فوٹو اپنے سینے سے چپکائے بار بار مندوبین کو اپنی درد بھری آواز سے متاثر کر رہی تھی ۔فوٹو اب میلی اور پرانی لگ رہی تھی ۔لیکن نہ جانے کون سی کشش تھی جو ہر مندوبین کو اس عورت کی طرف کھینچے لے جا رہی تھی ۔۔۔اور میں ان سب سے آگے تھی ۔۔۔

میں ۔۔۔ میں اسے کیسے نہ پہچان پاتی ۔ وہی ناک نقشہ ۔ وہی گھنگریالے بال ۔ وہی ہلکی لکیری موچھیں اور چہرے پر پھوٹی خشخشی ڈاڑھی ۔۔۔۔۔ وہ شکن آلودہ فوٹو میں بھی میری طرف اپنی معصوم مسکراہٹ اچھال رہا تھا اور میں اپنے انگ انگ میں اس کی خوشبو کو محسوس کرنے لگی تھی ۔۔۔

’’کامہ دیو ۔۔۔‘‘ میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی ۔۔۔

☆☆☆

روشنی کے لٹیرے

سجاد احمد دعا کر رہا تھا کہ جلدی سے شام ہوجائے اور یہ خوفناک ڈر شام کے اندھیرں میں کہیں گم ہوجائے۔ڈر ایسا کہ آنکھ بھی باہر جانکنے سے خوف کھائے۔گھر کے اندر بے بسی کے ساتھ ساتھ بے چینی کا عالم رقصاں۔ایک دوسرے کی طرف دیکھیں تو چہروں پر یاس اور نا امیدی جیسے ثبت ہوکر رہ گئی ہو۔ہونٹوں پر پیاس سے چھالے پڑے ہیں اور زباں بات کرتے لڑکھڑا رہی ہے۔سجاد احمد اپنی دونوں مضبوط باہوں میں دونوں بچوں کو چھپائے بیٹھا تھا۔آٹھ سالہ سلمان اور چھ سالہ بلقیس ایک دوسرے سے سر ملائے باپ کے کشادہ سینے سے چپکے بیٹھے تھے اور دونوں کے سروں کے اوپر باپ کا چہرا سایہ کئے ہوئے تھا۔سجاد کی نرم ونازک بیوی آسیہ سجاد کے کندھے پر سر رکھے دونوں بازو اس کے گلے میں جیسے لپیٹ چکی تھی اور ماں زون موج ان سب پر اپنا دوپٹہ ڈالے سایہ کئے ہوئے تھی۔اس کے ہونٹ بڑی تیزی کے ساتھ ہل رہے تھے شاید وہ مقدس آیات کا ورد کر رہی تھی۔۔ پہلے مسجدوں سے نعرے بلند ہوگئے تھے۔ پھر لوگوں کو گھروں سے باہر آکر سڑکوں پر امن مارچ میں شریک ہونے کی ہدایت دی گئی تھی۔ابھی لوگ مارچ میں شریک ہی ہو رہے تھے کہ فوج نے گیرا ڈال دیا۔ پتھراؤ شروع ہوگیا۔فوج نے آنسو گیس کے گولے داغے۔شاید پتھراؤ میں شدت آگئی تھی جو اب بندوقیں چل رہی تھیں۔ پہلے کہیں دور وقفے وقفے سے گولیاں چلنی شروع ہوگئیں تھیں پھر ایک دم تڑ تڑا کے ساتھ شروع ہوگئی تھی۔جیسے ایک ساتھ سینکڑوں مشین گنوں کے دہانے کھول دئے گئے ہوں۔دھماکے اتنے زور سے ہو رہے تھے کہ لگتا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔نعرہ بازی، چیخ وپکار اور دھماکوں کی گن گرج کی آوازیں اتنی قریب سے آرہی تھیں کہ کچھ

سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سجاد احمد مختلف گلی کوچوں سے بچتے بچاتے گھر پہنچا تھا۔ جہاں اس کی ماں زون موج اور اس کے بیوی بچے اس کے انتظار میں رو رہے تھے۔ جب تک وہ گھر سے باہر تھا۔ تب تک اس کی ماں نے سینکڑوں بار باہر جھانکا تھا۔ ساتھ ہی بہو اور بچوں کو دلاسہ بھی دے رہی تھی۔ جونہی سجاد احمد گھر کے اندر آیا زون موج نے لپک کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ بیٹے کے انتظار میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی ۔حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ اب گھروں کو بھی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ کئی گھروں کے ساتھ ساتھ سجاد احمد کے گھر کے سارے شیشے بھی چکنا چور ہو چکے تھے۔ جب بیوی بچوں نے ہنگامہ شروع کیا تو اس نے کھینچ کھینچ کر سب کو باتھ روم والی گلی میں لایا۔ جہاں پر یہ لوگ کسی حد تک خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ یہاں آ کر سبھی ایک دوسرے سے لپٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ اور برابر ایک گھنٹے سے اسی حال میں پڑے تھے۔ باہر کے حالات میں ابھی بھی کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔

اچانک کوئی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا تو ان سب کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ جب دوسری تیسری بار دروازہ پیٹنے کی آواز آئی تو سجاد احمد نے اٹھنا چاہا لیکن بچوں نے روتے ہوئے اسے پکڑ لیا اور آسیہ تو جیسے اس کے کندھے پر سوار ہی ہو گئی تھی۔ سجاد نے بیوی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسوں اور ہونٹوں پر التجا تھی۔ بچوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہروں پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ سجاد احمد نے بڑی بے بسی کے ساتھ ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ لیکن آسیہ نے اس کے پیر پکڑ لئے اور بچوں نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔ وہ بے بسی سے سب کی طرف دیکھنے لگی۔

دھڑام کی آواز آئی شاید دروازہ توڑ دیا گیا تھا اور ساتھ ہی بھاری قدموں کی آوازیں سارے گھر میں گھونج اٹھیں ۔ کچھ لوگ گالیاں دیتے ہوئے کمروں کے دروازے ٹھوکروں

سے کھول رہے تھے۔ تبھی کہیں سے ایک وردی پوش گلی کی طرف آیا اور بندوق تانے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ ماں زون موج ایک دم بچوں کو اپنے سایے میں لے کر سامنے آ کر سینہ تانے کھڑی ہو گئی۔ اسے پہلے کہ وردی پوش گولی مار دیتا ایک آواز آئی

''نہیں۔ راجیش۔۔۔ رک جاؤ۔'' وردی پوش کے پیچھے ایک اور وردی پوش کھڑا ہو گیا تھا۔ جو شاید ان کا آفیسر تھا۔ اس کے حکم سے سپاہی نے گولی تو نہیں چلائی۔ البتہ وہ حیرانگی سے حکم دینے والے آفیسر کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا کئی اور وردی پوش بندوقیں تانے ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔۔۔

''صاب ہم نے سارا گھر چھان مارا۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' ایک سپاہی اپنے آفیسر کو گھر کا حال بتانے لگا کہ اچانک اس کی نظر ان لوگوں پر پڑ گئی تو وہ چلایا اور بندوق ان کی طرف تان لی۔

''ارے وہ سالا تو ادھر بیٹھا ہے۔۔۔ باتھ روم میں۔ مار دو گولی سب کو۔ سالا اگروادی۔''

''نہیں۔ آ جاؤ۔ سب لوگ باہر آ جاؤ۔'' آفیسر نے سپاہیوں کو حکم دیا اور خود باہر کی طرف جانے لگا۔ سپاہی حیران ہو کر اپنے جاتے ہوئے آفیسر کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سجاد اور اس کی فیملی پر للچائی نظریں ڈال دیں اور آفیسر کی تقلید میں اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

آفیسر ان کو حیران و پریشان چھوڑ کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ یہ سب لوگ بہت دیر تک دم سادھے بیٹھے رہے۔ شاید ایک زمانہ گذر گیا۔ یا ایک صدی بیت گئی۔ ماں زون موج کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ مین دروازے کی طرف جانے لگی تو سجاد احمد بھی کھڑا ہو گیا۔ بچوں نے اسے روکنا چاہا لیکن آسیہ نے دونوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ سبھی ایک

دوسرے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ مین دروازے کی طرف بڑھنے لگے جس کی کنڈی ٹھوکروں سے اکھڑ چکی تھی۔

ابھی یہ لوگ دروازے تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ باہر پھر نعرہ بازی شروع ہو گئی اور ساتھ ہی آنسوں گیس کے گولے داغنے اور گولیاں چلنے کی آوازوں سے سارا ماحول گھونج اٹھا۔ سجاد احمد ٹوٹا ہوا دروازہ پھر سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک ساتھ کئی سپاہی اندر آ گئے اور سجاد احمد کو مارنے لگے اور اسے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگے۔ سبھی گھر والے چیخنے چلانے لگے۔ لیکن ان کو دکہ دے دے کر روکا جا رہا تھا۔ جب تک کچھ سپاہی سجاد احمد کو گھر سے گھسیٹ کر باہر سڑک تک لے جا چکے تھے۔ زون موج، آسیہ اور دونوں بچے روتے چلاتے باہر آ گئے اور سڑک کی طرف دوڑنے لگے۔ جہاں سجاد احمد سپاہیوں کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔ اچانک سلمان نیچے کی طرف جھکا۔۔۔ اور جب وہ کھڑا ہو گیا تو اس کے ننھے ہاتھ میں پتھر تھا۔۔۔ اس نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ پتھر سپاہیوں کی طرف اچھالا دیا۔۔۔

''صاحب جی آرڈر دو سالے کو بھون کے رکھ دوں گا۔'' سپاہی نے اس کی طرف بندوق تان کر کہا۔

''ارے گولی مت چلاؤ۔۔۔ مارنا نہیں۔۔۔ بچہ ہے۔۔۔ طاہر پیلٹ گن چلاؤ۔'' اور طاہر نے پیلٹ گن کا دہانہ کھول دیا۔۔۔

سجاد احمد نے اپنے گھر کی طرف دیکھنا چاہا لیکن سامنے دھواں ہی دھواں تھا جس میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ اندھیرا شام کی سرمئی دھند سے پھیل رہا ہے۔ یا یہ اس کی اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹ ہے۔ لیکن وہ جان چکا تھا کہ پیلٹ گن سے نکلے چھرے اس کے بیٹے کی دونوں آنکھیں چھید چکے ہیں اور وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابدی اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔۔۔

☆☆☆

حِصار

''بس بہت ہوگیا۔ اب آپ لوگ باہر آ جاؤ'' میں نے اپنے چھوٹے بیٹے عادل سے بہت زوردار اور کھردرے لہجے میں کہا۔ جو گھر نہ چھوڑنے کی سب سے زیادہ ضد کر رہا تھا۔

''اگر آپ لوگ اتنے ہی ڈرپوک ہیں تو آپ نکل جایئے۔ میں یہاں سے جانے والا نہیں ہوں۔ میں یہیں رہوں گا'' عادل نے بھی ایک عزم کے ساتھ کہہ دیا۔ اُس کی ضد مجھے پریشان کر رہی تھی، اور میں بہت زیادہ بےچینی محسوس کر رہا تھا۔

یہ 4 ستمبر 2014 کی تاریخ تھی۔ پچھلے دو دن سے مسلسل بارشیں ہو رہی تھیں۔ میں ایک ادبی کانفرنس کے سلسلے میں چار دن کے لئے سرینگر گیا تھا۔ لیکن بارشوں کا رخ دیکھ کر میں پہلے ہی دن واپس لوٹ آیا تھا۔ شام تک پانی کی سطح لگاتار بڑھ رہی تھی۔ مجھے بہت زیادہ تشویش ہو رہی تھی۔ اگر چہ ابھی گھر کے اندر پانی نہیں آ چکا تھا، لیکن آنے کا امکان حد درجہ بڑھ رہا تھا۔۔۔ ہم سبھی افرادِ خانہ برآمدے میں کھڑا تھے۔ اور بڑھتے پانی کی ایک ایک انچ کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ لگاتار گھڑی دیکھ کر ٹائم اور پانی کی سطح کا موازنہ کرتے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی پانی بڑھ جانے کے امکان پر پریشان بھی بہت ہو رہے تھے۔ ایک ایک انچ کا اضافہ ہمارے دلوں کی دھڑکن اور تیز کر رہا تھا۔ ہماری نظریں ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صحن میں لگی پھولوں کی کیاریاں، چھوٹے بڑے پودے، گلاب کی ٹہنیاں۔۔۔، ان سب پر ہماری نظریں تھی، کون سا پودا ڈوب گیا اور کون ڈوب رہا ہے وہ ہم دیکھ رہے تھے۔۔۔ گلاب کے پودے کی ٹہنیوں پر ایک ساتھ بہت سارے گلاب کھِل اٹھے

تھے۔ پودا خوبصورت گلدستہ جیسا لگ رہا تھا۔ میری نظریں برابر اس پر جمی تھیں۔ بارش کے قطرے گلاب کی پتیوں پر موتیوں کی طرح پھسل رہے تھے اور ٹہنیاں بارش کے دباؤ سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ رم جم کرتی بارش کی تال پر مست مست جھوم رہی تھیں۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی گلاب کی پنکھڑیوں تک آ گیا اور ٹہنیاں ہلنا جلنا بھول گئیں، جیسے پودا اب زندگی کی جنگ ہارنے کے قریب آ گیا ہو۔۔۔

''اوہ نووووووو'' اچانک میری بیٹی آسی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں بہت گھبرا گیا۔

''کیا ہوا۔۔۔آسی۔۔۔آسی۔۔۔ کیا ہو گیا''

''ابو۔۔ابو۔۔۔گلاب کا پودا۔۔ڈوب گیا۔۔۔'' اور وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ میرے بیٹے کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میری بیوی آسی کو سنبھال رہی تھی۔ میری ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔اور اس کے ہونٹوں پر مقدس آیات کا ورد تیز ہو رہا تھا ۔۔۔۔تب مجھے احساس ہو گیا کہ ایک میری ہی نہیں ہم سبھوں کی نظریں گلاب کی ٹہنیوں پر ہی لگی تھیں جواب کب کی پانی کی قبر میں دفن ہو چکی تھیں۔۔۔۔عادل نے پھر سے گھڑی دیکھی اور انگلی سے برآمدے کے اوپر آ رہے پانی کی سطح کو چیک کیا۔۔۔

''ہووووو۔۔۔ایک گھنٹے میں نو انچ'' ہم سب میں بے چینی کی لہر جیسی پھیل گئی تھی۔

''عادل بیٹا۔ اب ہم کو یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔'' عادل نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ لگاتار انگلیوں سے پانی کی سطح چیک کر رہا تھا۔اُس کی گھر نہ چھوڑنے کی ضد مجھے پریشان کر رہی تھی۔اسی کی ضِد کی وجہ سے اب تک ہم گھر کا کوئی بھی سامان نکال نہیں پائے تھے۔اب وہ موقعہ بھی ختم ہو چکا تھا۔قریب میں ایسی کوئی جگہ بھی نہیں بچی تھی جہاں ہم اپنا

سامان رکھ سکتے تھے۔ سارا اڑوس پڑوس ڈوب رہا تھا۔ ہر طرف ہاہا کار مچی تھی۔۔۔ ویسے بھی اس تیز بارش میں کچھ نکال کے لے جانا ممکن بھی نہیں تھا۔ کچھ لوگ جو سامان نکالنے کی کوشش کر بھی رہے تھے، وہ بارش میں بھیگ رہے تھے۔ سامان اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس لئے زیادہ تر لوگ کھینچ کر لے جا رہے تھے، جس کی وجہ سے ان کا سامان خراب اور کیچڑ سے لت پت ہو رہا تھا۔۔۔۔ اب دن ڈوب رہا تھا۔ آسمان تو پہلے ہی کالے بادلوں سے گرا تھا۔ اب شام کا سرمئی رنگ اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ بارشیں زور پکڑتی جا رہی تھی۔۔۔ منظر بڑا پرُ خوف اور پرُ خطر لگ رہا تھا۔۔۔ مجھے یقین ہو رہا تھا کہ اب یا جب ہمیں گھر چھوڑ کے جانا ہوگا۔ ابھی مغرب کی اذان کا وقت بھی نہیں ہوا تھا، کہ میں نے سب کو رات کا کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ پتہ نہیں تھا کب اور کہاں پہنچیں گے، کس کے گھر جائیں گے اور پھر وہاں کھانا نصیب ہوگا بھی کہ نہیں۔۔۔ لیکن ابھی ہم نے دو دو نوالے بھی منہ میں نہیں ڈالے تھے کہ عادل چیخ پڑا۔ کمرے کے فرش میں شگاف پڑ رہے تھے، جن سے پانی آ رہا تھا۔ سب لوگ کھانا چھوڑ چکے تھے۔ کمرے میں چیخ و پکار تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے ان کو خاموش کرایا۔ ابلتے پانی میں اگرچہ پھوارے جیسا ابال نہیں تھا۔ لیکن پانی آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا اور بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جمع ہو رہا تھا۔ عادل جو تھوڑی دیر پہلے تک گھر چھوڑنے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا، اب وہ سب سے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا، سراسیمہ تو ہم سبھی لوگ تھے۔ لیکن عادل کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ اب وہ عجلت میں گھر چھوڑنے کا اصرار کر رہا تھا۔ اُسی کی ضد کی وجہ سے ہم گھر کی کوئی چیز نکال بھی نہیں پائے تھے۔۔۔ پھر بھی میں جاتے جاتے کچھ چیزیں لگے ہاتھوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا اٹھاؤں اور کیا نہ اٹھاؤں۔۔۔

سب سے پہلے میری نظر شیشے کی الماری کی طرف گئی، جس میں میری بیوی نے بڑے سلیقے اور قرینے سے فلاسک، کپ پلیٹ، ڈِش ڈونگے، چمچے اور بہت ساری ڈیکوریشن

کی چیزیں سجا کے رکھی تھیں۔ پر میں کہاں سے شروع کروں؟ کیا کیا اٹھاؤں؟؟ نگاہیں گماتے گماتے میری نظر حال ہی میں خریدے گئے اُون(Oven) کی طرف گئیں، جس کو خریدتے وقت مجھے دس بار سوچنا پڑا تھا، لیکن میری بیوی یہ اون(Oven) اپنی بہن کے گھر میں دیکھ چکی تھی، جس کو اب خریدنا میرے لئے ناگزیر بن گیا تھا۔ پر اسے اٹھانا اور اٹھا کے لے جانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔تبھی میری نظر LCD پر پڑی، جس کو میں نے پچھلے سال ہی خریدا تھا جب ہمارا دس سالہ پرانا، لیکن مہنگا Sharp ٹی وی Short-circuit سے جل گیا تھا، لیکن اس وقت اسے اٹھانے کی کوئی تُک نہیں تھی۔ آدمی ٹی وی کے بغیر بھی تو زندہ رہ سکتا ہے۔۔۔اب میری نظریں بار بار میری بیٹی کے بڑے سے ٹرنک (بکسہ) کی طرف جارہی تھیں، تو میرے دل سے ہُوک سی اٹھ گئی، جب ہمارے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی تھی، تو ابا جان نے کہا تھا، آج سے ہی اس کی شادی کی فکر کرو، کل آسانی ہوگی، ابا جان کے انتقال کو کئی سال ہوگئے، پر میری بیوی نے اس کی یہ بات گرہ باندھ کے رکھ لی تھی۔ تب سے ہم لگاتار بیٹی کا جہیز تیار کررہے تھے۔ جب بھی مجھے کبھی کوئی الاونس نقد میں ملا، پراموشن کے وقت ایکسٹرا پیسہ ملا، یا کبھی کسی مہینے کے خرچے میں کمی کر کے کچھ بچالیا، تو ہم سب سے پہلے بیٹی کی شادی کے لئے کچھ نہ کچھ خرید کر لاتے تھے۔ اور اسی بکسے میں جمع کر تے رہتے تھے۔ لیکن اسے اٹھانے کے لئے کم سے کم چھ آدمی درکار تھے۔۔۔ساتھ ہی میری ماں کا کمرہ تھا، جہاں برسوں پرانے نادر نسخے اور نمونے رکھے پڑے تھے۔ میری دادی کا لکڑی کا بڑا بکسہ جو اُسے اپنے باپ یعنی میرے بڑے نانا نے دہیج میں دیا تھا۔ اس بکسے میں دادی کی کچھ چاندی کی جیولری، دادا کی موٹی دانوں والی تسبی، ایک موٹا چشمہ، معمولی و غیر معمولی سامان کے علاوہ اور بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔ مرنے سے پہلے دادی نے یہ بکسہ میری ماں کے حوالے کیا تھا، اور جب ہم نے یہ نیا گھر بنایا، میری ماں نے پرکھوں کی

نشانی سمجھ کر اسے تبرکاً اپنے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔۔۔ پھر اس بکسے میں ماں نے میرے مرحوم ابا جان کی بہت ساری نشانیاں سجا کے رکھ دیں۔ میں نے کئی بار ماں کو یہ بکسہ کھولتے اور میرے ابا جان کی چیزوں کو چہرے سے لگا کر روتے دیکھا ہے۔۔۔ کمرے میں میرے ابا جان کی لائی اور بھی سینکڑوں چیزیں رکھی تھیں، جن میں تانبے کے برتن (کندکاری سماوار، تش ناری، دیگ اور دیگچے، اور بھی بہت ساری پرانی لیکن قیمتی ساز و سامان، جن کا استعمال اب کبھی کبھار Occasionally ہی ہوتا ہے) پرانے طرز کے گبے اور گالیچے، بہت سارے کشمیری قالین۔ یہ کمرہ نہیں بلکہ پورا میوزیم تھا، یہاں سے کچھ نکال کر لے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔۔۔ پھر بیٹے کے کمپیوٹر کا خیال آ گیا، اپنی الماری میں رکھی کتابیں (جن میں کچھ نادر اور نایاب کتابیں بھی تھیں) یاد آ گئیں۔۔۔ کمروں کی Furnishing، آسی بیٹی کا لایا چھوٹا سا لیکن خوبصورت فانوس جو چھت میں لگا تھا، Electrical and electronic Goods، آخروٹ کی لکڑی سے بنا بیڈ، اور اس پر پڑے گرم کمبل اور بستر ا۔۔۔ یہ تو ساری بڑی اور باری چیزیں تھیں، جنہیں اُٹھا کے لے جانا ناممکن تھا۔۔۔ اب میرا دھیان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف گیا۔ پر ان میں سے اٹھاؤں کیا، اور چھوڑوں کیا۔ یہاں کی ہر شئے مجھے ایک کہکشاں سی لگ رہی تھی، دوشالے میں جھڑے ستاروں کی مانند۔ ہر چیز خوبصورت اور خوبرو لگ رہی تھی، دل لبھانے والی۔۔۔، یہاں کی در و دیوار میں مجھے اپنے ماضی اور حال کی سینکڑوں کہانیاں زندہ جاوید نظر آ رہی تھیں، جب بھی جو بھی چیز ہم نے لائی، اس کو رکھنے، سجانے اور سنوارنے میں ہم سب نے گھنٹوں سوچ بچار کیا، تب اُسے سلیقے سے، قرینے سے مناسب جگہ پر رکھ دیا کرتے تھے۔۔۔ یہ کوئی اینٹ گارے کا مکان تھوڑی تھا، یا کوئی خیرات میں ملی وراثت، اس گھر میں میرے ابا جان اور امی کے وہ ڈھیر سارے سپنے تھے، جو انہوں نے ساری عمر میری پڑھائی، میرے روزگار اور میری گھر گرہستی کے لئے بُنے تھے۔۔۔ یہ تو

میری دنیا تھی ۔۔۔میری پوری کائنات تھی ۔۔۔،جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر مکمل تھی، ترتیب وار تھی ،خوبصورت ، دلکش اور دلفریب تھی ۔۔۔۔۔۔اب اس میں سے میں کیا اُٹھاتا۔۔۔؟اور کیا چھوڑ کے جاتا۔۔۔؟؟؟میں تو بس یہی سوچ رہا تھا، کہ میرے بازووں میں اتنی طاقت آجائے، کہ میں اپنی اس خوبصورت کائنات کو اُٹھا کر، اپنے سینے سے لگا کر کہیں دور جا کر بسا لوں، جہاں نہ آسمانی آفتیں ہوں، اور نہ زمینی بھلائیں ہوں۔۔۔بس میں اور میری یہ چھوٹی سی کائنات ہو۔۔۔

''چلو پاپا۔کیا دیکھتے ہو، پانی گھٹنوں تک آگیا ہے۔اب تو چلو۔۔۔چلو چلو، یہاں سے نکلو'عادل مجھے کندھے سے جھنجھوڑ رہا تھا، اور ہم سب بڑی عجلت میں گھر سے باہر آگئے تھے۔باہر چاروں اوور اندھیرا چھیل چکا تھا۔ہم برآمدے سے صحن میں آگئے،تو پانی ہمارے سینوں تک آچکا تھا۔ہم سبھی افراتفری میں آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔بڑی مشکل اور کافی کشمکش کے بعد ہم اس جگہ پر آگئے تھے، جہاں سے ہم بنا کسی دشواری کے کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکتے تھے۔۔۔اب یہاں پر ہم لمحہ بھر کے لئے رک گئے تھے، اور میں نے ایک ایک کر کے سب کا نام لیکر پکارا،سب نے جواب دیا پر ماں کی آواز نہیں آرہی تھی۔

''ماں ۔۔۔ماں ۔۔۔آسی آسی ماں کہاں ہے''میں بڑی بے چینی کے ساتھ چیخ پڑا تھا۔

''دادی۔؟؟ دادی کہاں ہے۔۔۔ میں نے دادی کو بکسہ کھولے روتے دیکھا ہے۔اس کے ہاتھ میں دادا جی کی فوٹو تھی۔میں نے تو اسے آنے کے لئے کہہ بھی دیا تھا۔لیکن اندھیرے میں یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔'' آسی زور زور سے رونے لگی۔

اب جو میں بے صبری سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگا،تو میری بیوی نے روتے

ہوئے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، جو پیچھے کی طرف دیکھ کر اشارہ کر رہی تھی۔ میں بھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف دیکھنے لگا، تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔۔۔

''ماااااں ں ں ں؟؟؟'' پیچھے ہماری پوری کائنات، ہمارا گھر آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔۔۔اب وہاں حدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔۔۔ میری بیوی، میرے بچے زاروقطار رو رہے تھے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر میرے گرد ایک مضبوط حصار باندھ رہے تھے۔۔۔

☆☆☆

ایک فیصدی کا انسان

اے ے ے ے۔۔۔سن سن سن ۔۔۔میں نناوے فیصد شیطان ہوں۔شیطان کیا میں شیطان کا گرو ہوں اور وہ میرا چیلا۔ ہر صبح کام پر نکلنے سے پہلے شیطان مجھ سے ملنے آ جاتا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے آ گیا مانگتا ہے۔گرو مہاراج آج میں کہاں سے شروع کروں۔ کس کا بھیڑا غرق کر دوں، کس کی نیا پار لگا دوں۔جب میں اسے اجازت دیتا ہوں تبھی کام پر نکل جاتا ہے۔اچھے انسانوں کے قدموں کے آگے کیلے کے چھلکے پھینکتا ہے اور اپنے جیسے لوگوں کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔۔

اے میرے ناداں دوست میری بات غور سے سن۔میں بلاجہ نہیں مار رہا ہوں تم کو۔ جان بوجھ کر خون کر رہا ہوں تمہارا۔ہاں ہاں جلتا ہوں میں تم سے۔تمہاری کامیابیوں سے میرا دل لہولہان ہے۔مجھے میری ناکامیوں سے نفرت ہے۔اپنی نااہلی سے مجھے بیر ہے۔مجھے معلوم ہے میں تجھ سے تیری ذہانت، تیری قابلیت تم سے چھین نہیں سکتا۔لیکن تجھے نیست نابود کر کے تیری کامیابیوں پر قدغن تو لگا ہی سکتا ہوں نا۔۔۔

اے ے ے ے۔۔۔سن سن سن ۔۔۔میں نناوے فیصد شیطان ہوں۔شیطان کیا میں شیطان کا گرو ہوں اور وہ میرا چیلا۔

سن لڑکی۔۔۔ مجھے جو چیز اچھی لگتی ہے، اسے میں حاصل کر کے ہی رہتا ہوں۔اور میرے لئے تم بھی ایک چیز سے زیادہ کچھ نہیں ہو۔تیرا اغوا کیسے کرنا ہے یہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔تیرے کپڑے کھرچ کھرچ کے کیسے کھرچنے ہیں مجھے پتہ ہے۔اس کے بعد تیرا کیا حشر ہونے والا ہے وہ تیرے لئے بہت ہی بھیانک ہوگا لیکن میرے لئے اس میں مزہ

ہے،سواد ہے،موجاہی موجاں ہے۔تیری چیخیں بند کرنے کے لئے مجھے تیرامنہ بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے،میں سیدھا گلہ کاٹ دیتا ہوں۔

اے ے ے ے۔۔۔سن سن سن۔۔۔میں نناوے فیصد شیطان ہوں۔شیطان کیا میں شیطان کا گروہوں اور وہ میرا چیلا۔

تیرا سرکاری کنٹریکٹ ہے نا۔ یہاں بہت بڑا اسپتال بنانا ہے نا تجھے۔ جہاں ڈاکٹر ہونگے۔نرسیں ہونگی۔ مریضوں کا علاج ہوگا۔پر تیرا علاج میرے پاس ہے۔تیرا ڈاکٹر میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تجھے کونسی بیماری لگی ہے۔اسپتال کی دیواریں بنانے میں دو نمبر کی باجری ریت کے ساتھ دھول مٹی والا سیمنٹ ملائے گا۔سرکاری کارندوں کے آشیرواد سے ستر فیصد رقم مل بانٹ کے کھائے گا۔۔۔ پہلے میرا حصہ نکال، باڑھ میں جائے تیرا اسپتال،مریض اور ڈاکٹر۔تیرا کلیجہ چیر کے نکالوں گا میرا حصہ۔اے ے ے بلیک میلر ہوگا تیرا۔۔۔میرا حصہ میرے اکونٹ میں ڈال دے۔نہیں تو تیرا اکونٹ بند کر دوں گا۔۔۔ خلاص۔

اے ے ے ے۔۔۔سن سن سن۔۔۔میں نناوے فیصد شیطان ہوں۔شیطان کیا میں شیطان کا گروہوں اور وہ میرا چیلا۔

وہ ہمارے عقیدے کے لوگ نہیں ہیں۔ان کا ہماری زمیں پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔کوئی ادھیکار نہیں ہے۔بھون ڈالو سب کو۔ جہاں بھی موقعہ ملے بھسم کر دوان کو۔سنو تمہارے کارخانے میں جو یہ چھوٹے چھوٹے چوزے پل رہے ہیں نا یہ ہمارے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔ایٹم بم ہیں ہمارے۔۔۔ان کو مقدس کتاب سے اپنے مطلب کے پنے پڑھالو۔ان میں مرنے کا شوق اور جنت کی چاہت بڑھالو۔تاکہ شہد کی نہروں کا مزا اور حوروں کا چسکہ ان کو دن رات بے قرار رکھے۔ان کی شریانوں کا خون بڑھا دیں۔۔۔آج

ایک ننھے بالک کو تیار کر لے۔ اسے جمعہ کی عبادات کے ثواب سمجھا دینا۔ نہلا دھلا کے عطر و ادفر سے اس کا جسم مل دینا۔ بچے کو پوری طرح سے سجانا سنوار دینا۔ سفید لباس پہنا دینا تا کہ وہ خشوع خضوع اور مضبوط عقیدت کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جائے۔ کرتہ پاجامے کے اندر اس کے سارے جسم پر بارود باندھ کر رکھنا۔ اسے جمعہ کے دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں بھیج دینا ہے۔ اور ریموٹ میری گاڑی میں رکھ دینا۔ اس کے غریب باپ کو گذارے کے لئے ایک لاکھ کے ساتھ بچے کے نام خیرات اور فاتحہ خوانی کے لئے بھی بیس تیس ہزار بھیج دینا۔ تا کہ اسے لگے کہ مرنے کے بعد بھی اس کا بیٹا سوا لاکھ کا۔

بیٹا۔۔۔ بیٹا دیکھنا باہر کون ہے۔ ماں یہ کوئی مائی ہے جو کھانا مانگ رہی ہے۔ کیا ۔۔۔ کھانا نہیں ہے۔ ماں میرے کھانے کی دو روٹیاں دے دے۔۔ ماں۔ بھوکی ہوگی بے چاری ۔۔۔

اے ے ے بابا کیا بات ہے۔۔۔ اووو اتنا بیمار ہے۔ کچھ مدد چاہئے نا۔ لیکن بابا میں زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔ پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ غریب آدمی ہوں بابا۔ خون کی ضرورت ہے۔۔۔ ہاں خون کی ضرورت ہے تو جتنا چاہئے میری رگوں سے نکال دے۔ تیرا بیٹا بچ جائے گا۔ غم نا کر بابا۔۔۔

لے بھائی۔ بس دو کنگن ہیں۔ میری ماں نے اپنی بہو کے لئے رکھے تھے۔ وہ کیا ہے کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔ تو رکھ لے بھائی۔ ابھی تیری بہن کی شادی ہو جانے دے۔ میری بیوی کے لئے نئے کنگن آ جائیں گے۔۔ لے بھائی رکھ لے۔

اے ے ے بھاگوان یہ کیا کر رہی ہو تم۔ چھوٹی بچی ہے۔ پانچ پانچ دس دس روپئے کی کنگھی، چوڑیاں بیچ رہی ہے۔ یہ دیکھ یہ بالوں میں باندھنے والا ربن کیسا لال لال ہے۔ دیکھو نا بچی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ اپنے ہاتھ سے کام کر کے کچھ کمانا چاہتی

ہے۔۔۔کیا بولی۔۔۔تم ایسی سستی چیزیں نہیں خریدتی۔۔۔ارے خرید لے یار۔یہ سوچ کے خرید لے کہ بچی بھوکی ہوگی۔تیرے بیس تیس روپئے سے روٹی کھائے گی۔۔۔اے ے ے بیٹا دے سو روپئے کے۔۔۔ہاں یہ لال اور یہ نیلا ربن دے۔یہ کھنکتی چوڑیاں بھی دے دیں۔یہ بالوں کو سنوارنے والی کنگھیاں بھی دے دیں۔

''یہ کیا کر رہا ہے۔پل میں شیطان، دوسرے پل انسان۔۔۔ یہ کیا ہے۔''

''یہ ایک فیصد ہے۔جو میں کرتا ہوں۔''

''اور وہ باقی ننانوے فیصد؟ اے ے ے ے۔۔۔سن سن سن۔۔۔میں ننانوے فیصد شیطان ہوں۔شیطان کیا میں شیطان کا گرو ہوں اور وہ میرا چیلا۔۔۔وہ کیا ہے؟؟''

''ارے ے ے ے وہ۔۔۔وہ ننانوے فیصد میرا شیطان۔۔۔میرا نفس ہے۔۔۔یہ ایک فیصد میرا زندہ ضمیر ہے۔۔۔ارے بابا انسان ہوں آخر۔''

☆☆☆

یار زندہ صحبت باقی

''بشیر احمد کی جان حاضر ہے دوست۔میں ہوں نا تیرے ساتھ۔تم خود تیر کے جاؤ گے۔یہ میرا وعدہ ہے۔پہلے میں پانی میں اتر جاؤں گا۔تم میرا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتر جانا۔پھر میں تمہیں پار لے کر جاؤں گا۔یہ میچ جیتنا ہے ہم دونوں کو۔۔۔بس''بشیر احمد کے فلمی انداز پر علی محمد نے زوردار قہقہہ لگایا۔اور دونوں دوست ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔

کھیتوں میں چاروں طرف سرسوں کے پھول کھلے تھے۔بادام،خوبانی،آڑو اور سیبوں کے پیڑوں پر شگوفے اپنی جوبن پر تھے۔یہ موسم بہار کا سہانا دن تھا۔دھوپ میں حرارت بڑھ رہی تھی۔کئی گاؤں کے اسکول ایکس کرشن منانے نالہ لدر کے کنارے آئے ہوئے تھے۔سماواروں میں کیسری قہوہ ابل رہا تھا۔آس پاس خوشبو پھیل رہی تھی۔چند بچے لدر کے پانی سے ہاتھ منہ دھونے کے بعد قہوہ پی رہے تھے۔اساتذہ نگرانی کر رہے تھے کوئی بچہ پانی میں نہ اتر جائے۔قہوہ پینے کے بعد بچوں کی تیراکی کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔جس میں تین اسکولوں کے دو دو بچے حصہ لے رہے تھے۔آزاد پور ہائی اسکول سے بشیر احمد اور علی محمد کا انتخاب ہو چکا تھا۔لیکن علی محمد حصہ لینے سے گھبرا رہا تھا۔اور بشیر احمد اسے حوصلہ دے رہا تھا۔مقابلہ شروع ہوا۔تینوں اسکولوں کے چھ استاد پانی میں کھڑے ہوگئے۔تاکہ کوئی بچہ ڈوب نہ جائے۔آخر یہ مقابلہ بشیر احمد اور علی محمد نے جیت لیا۔سارے اسکولوں کے بچوں نے تالیاں بجائیں اور اساتذہ نے ان کو شاباشی دی۔

ماہ و سال بدلے۔کھیت کھلیانوں کے حال بدلے۔دیوار سے کلنڈر پہ کلنڈر اترتے گئے اور زندگی تیز رفتار گھوڑے پر بھاگتی رہی۔حالات نے بشیر احمد کو یہاں لا کھڑا کر دیا تو علی محمد کو

کہیں اور پھینک دیا۔ ۔۔ یہ وقت کی ستم ظریفی ہی کہی جاسکتی ہے۔ دونوں دوست ایسے بچھڑے کہ پھر بوڑھاپے تک کبھی ملنے کا موقعہ ہی نصیب نہ ہوا۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے اور ایک ہی اسکول میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔لیکن ابھی یہ نویں کلاس میں ہی تھے کہ علی محمد کا باپ سخت بیمار ہوگیا۔کافی علاج معالجہ کرانے کے بعد بھی وہ جاں بر نہ ہوسکا اور انتقال کرگیا۔اس کی ماں علی محمد کو ساتھ لے کر اپنے مائیکے سرینگر چلی آئی۔ یہاں علی محمد کا داخلہ ایک اچھے اسکول میں کرایا گیا۔وہ ذہین لڑکا تھا۔پڑھائی میں اچھا تھا۔اس لئے سارے امتحانات اچھے نمبرات کے ساتھ پاس کرتا گیا۔اس کی ماں علی محمد کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی اور بھائیوں نے اس کا بھر پور ساتھ دیا۔انہوں نے علی محمد کا ایڈمشن ملک سے باہر ایک بڑے میڈیکل کالج میں کرادیا۔

بشیر احمد اپنے گاؤں کے اسکول کا چاہتا سٹوڈنٹ تھا۔ ہر کھیل میں حصہ لیتا تھا۔لیکن تیراکی میں اسے کمال حاصل تھا۔بی پی ایڈ کے بعد اس نے فیزیکل ایجوکیشن میں ماسٹرس کی ڈگری لی۔ واپس آتے ہی اس کو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں فیزیکل ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ کچھ سالوں کے بعد ہی بشیر احمد کا نام محکمہ تعلیم کا اہم نام بن گیا۔بچوں کے کھیل کود میں اس کی دلچسپی اور ان کی تربیت نے انہیں بہت مقبول بنادیا۔ہائر ایجوکیشن میں پوسٹنگ کے بعد تقریباً کشمیر کے سبھی کالیجز میں اس نے ڈیوٹی انجام دی۔ یہاں تک کہ بشیر احمد کو سپورٹس کونسل کا اعزازی ممبر بنادیا گیا۔اب اس کی رٹائرمنٹ کے ڈھائی سال ہی باقی بچے تھے تو سرکار نے اسے کالج آف فیزیکل ایجوکیشن کا پرنسپل بنادیا۔اس کے ڈسٹرکٹ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس کے گاؤں میں کئی دن تک جشن جیسا سماں بندھا رہا۔

فزیکل کالج میں یہ اس کا آخری سال تھا۔ ہر سنیچر وار کو گھر جانا اور سوموار کو واپس کالج آنا اس کا معمول تھا۔سوموار کے دن جب بشیر احمد کالج پہنچا تو اچھی بوندا باندی شروع ہوچکی

تھی ۔ شام تک بارش میں تیزی آ گئی ۔ پھر بارشوں کا سلسلہ رکا نہیں اور تیسرے دن سارا اردگرد پانی میں ڈوبنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب جیسی صورت حال بن گئی ۔ بارشیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں ۔ سرکاری طور کوئی پیشن گوئی بھی نہیں کی گئی تھی ۔ کہ اچانک سیلاب میں سارا کشمیر ڈوب گیا۔ اب سرکار حرکت میں آ گئی تھی ۔لیکن حالات کسی کے قابو میں نہیں تھے ۔ لوگوں کو نکالنے اور محفوظ مقامات پر پہچانے کا کام زیادہ تر لوگ خود ہی کر رہے تھے ۔ بہادر نوجوان اور کشتی بان زیادہ شدومد سے لوکوں کو نکال کر محفوظ مقامات پر لیجا رہے تھے ۔ بشیر احمد نے اپنے سٹوڈنٹس کو بلایا ۔ جو آ سکتے تھے وہ آ گئے ۔ اس کے کالج میں لڑکوں کو تیراکی سکھانے کے لئے دو کشتیاں رکھی تھیں ۔ ان کی مدد سے اس نے کئی گھروں سے لوگوں کو نکالنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ اس کے سٹوڈنٹس نے بھی جان جوکھم میں ڈال کر لوگوں کی زندگیاں بچالیں ۔ کسی نے اسے بتایا راج باغ کا علاقہ سیلاب سے زیادہ متاثر ہے ۔ وہاں کئی گھروں میں بزرگ اور بیمار لوگ پھنسے ہیں جو دوائی اور کھانے کے لئے ترس رہے ہیں ۔ اس کی دونوں کشتیاں جواب دے چکی تھیں اور انہیں مرمت کی سخت ضرورت تھی جوان حالات میں ممکن نہیں تھا ۔ ۔ ۔ اسے اپنے ایک اسٹوڈنٹ سے معلوم ہو گیا کہ ایک ڈاکٹر اپنی بیمار ماں کے ساتھ ایک مکان میں پھنسا پڑا ہے ۔ اس کی باقی ساری فیملی تو نکالی گئی ہے لیکن بیمار ماں کو وہ نکال نہیں پایا ہے اور اس کا گھر زیادہ دنوں تک سیلاب کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا ہے ۔ کیونکہ وہاں پر سیلاب کا دباؤ بہت زیادہ ہے ۔ نہ جانے بشیر احمد کے دل کے کس کونے میں ٹیس سی اٹھی ۔ وہ کسی بھی طرح وہاں پہنچنا چاہتا تھا ۔لیکن اس کی کشتی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کب ساتھ چھوڑ جائے ۔ ۔ ۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ۔ وہ وہاں جانا چاہتا تھا ، عقل اسے روک رہی تھی لیکن دل اسے کھینچے جا رہا تھا ۔ آخر اس نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ۔ اس کے سٹوڈنٹس اسے منع کر رہے تھے ۔لیکن وہ جانے پر بضد تھا ۔ اب اس کے سٹوڈنٹس بھی اس کے

ساتھ جانا چاہتے تھے۔لیکن اس نے صرف عارف کو اپنے ساتھ لے لیا۔ عارف سوئمنگ کا اچھا کھلاڑی تھا اور وہ لگا تار ایک گھنٹے سے زیادہ تیرا کی کر سکتا تھا۔کشتی کی معمولی مرمت اور ضرورت کا سارا سامان رکھنے کے بعد دونوں راج باغ کی طرف بڑھنے لگے۔کہیں کہیں پر پانی کی رفتار تیز تھی۔اور اچھل اچھل کر گھروں سے ٹکرا رہا تھا۔بشیر احمد کشتی کو سنبھال کر آگے لے جا رہا تھا۔لیکن ایک جگہ پانی کے ایک ریلے نے کشتی کو اچھال دیا۔

''عارف ناؤ کو مضبوطی سے پکڑو'' بشیر احمد زور سے چلایا۔۔۔کشتی جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی گئی اور پھر پانی پر جا گری۔ بشیر احمد اور عارف پانی میں گرنے سے بچ تو گئے لیکن کشتی کے پتوار ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔اور کشتی میں بھی بہت سارا پانی بھر گیا تھا جسے عارف کشتی سے بندھے برتن سے باہر نکالنے لگا۔

''عارف ہمارے ہاتھ خالی ہیں۔ناؤ کو پتوار کے بغیر ہم زیادہ دور نہیں لے جا سکتے۔پانی کا چھوٹا سا ریلہ بھی اسے کہیں بھی اچھال سکتا ہے۔ہمیں ناؤ کو کہیں باندھنا ہوگا۔''

''جی سر۔وہ اس گھر کی اوپری کھڑکی سے ہم اسے باندھ سکتے ہیں۔لیکن وہاں تک پہنچ جانا ناممکن ہے۔کیونکہ ہمیں ناؤ کو پانی کے بہاؤ سے بچا کر لے جانا ہوگا۔ جو ناممکن ہے۔''

''نہیں عارف۔ناممکن نہیں ہے۔ہاں مشکل ضرور ہے۔میں ایسا کرتا ہوں کہ میں پانی میں کود جاتا ہوں۔کشتی کی رسی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔میں اس گھر تک تیر کے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔''

''نہیں سر یہ ناممکن ہے۔اس بہاؤ کو تیر کے پار کرنا ناممکن ہے۔ پانی کہیں بھی اچھال دے گا۔جان کا خطرہ ہے سر۔''

''یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا عارف۔ہمیں اس گھر تک پہنچنا ہوگا۔''

''تو آپ رک جائے سر۔میں جاتا ہوں۔آپ کی جان کوخطرہ ہے۔''

''خطرہ تو ہم دونوں کی جان کا ہے۔لیکن اب یہ دیکھنا ہوگا کہ جان کس کی زیادہ قیمتی ہے۔''

''جان تو آپ ہی کی قیمتی ہے سر۔''

''نہیں عارف بیٹا۔جان آپ کی قیمتی ہے۔میری رٹائرمنٹ کے اب کچھ ہی مہینے باقی ہیں۔اور آپ کے لئے ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔۔۔اور ویسے بھی میں یہاں جان دینے کے لئے نہیں آیا ہوں۔کسی کی جان بچانے آیا ہوں۔اور شاید وہ جان میرے لئے سب سے زیادہ قیمتی ثابت ہو۔۔۔اچھا اللہ حافظ۔پھر ملتے ہیں'' یہ کہتے ہی۔بشیر احمد نے کشتی کی رسی کمر سے باندھ دی اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔عارف ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں بشیر احمد پر ہی لگی تھیں۔بشیر احمد تیرتا ہوا بہاؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔اچانک پانی کے ریلے نے بشر احمد کو کئی فٹ اوپر اچھال دیا اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا سر کے بل پانی میں جا گرا۔عارف کی چیخ نکل گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے اپنے شفیق استاد کی ساری شفقتیں یاد آ گئیں۔اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور پانی میں ڈوبتے اپنے چاہتے استاد کو تلاشنے لگا۔اچانک اس کا چہرہ مسرتوں سے کھل اٹھا۔بشیر احمد نے پانی سے سر نکالا۔وہ پار والے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے آسانی سے گھر کی کھڑکی پکڑ لی اور اس کے سہارے پانی سے باہر آیا اور گھر کی کھلی کھڑکی پر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر دم سنبھالا۔چہرے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیر لئے اور مسکرا کر عارف کی طرف ہاتھ ہلایا۔ عارف بھی ہاتھ ہلا رہا تھا۔اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔لیکن اس کی آنکھیں نم تھیں۔بشیر احمد عارف کو اشارے سے سمجھا رہا تھا کہ جب میں رسی کو کھینچوگا۔آپ کشتی کو مضبوطی سے پکڑنا تا کہ جب کشتی بہاؤ میں پہنچ جائے تو وہ اپنی بیلنس کھونہ

دے۔ عارف بھی مشاق تیراک تھا۔ وہ کشتی کو آرام سے بشیر احمد تک لے کر آیا۔ کھڑکی سے کشتی کو باندھ کر دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔ یہ مکان کی دوسر منزل تھی۔ یہاں بھی پانی پہنچ چکا تھا۔ وہ تیسری منزل کی سیڑیاں چڑھنے لگے۔ بشیر احمد ساتھ ساتھ آوزیں بھی دے رہا تھا۔

''کوئی ہے۔۔۔گھر میں کوئی ہے۔''

''کون ہے۔کیسے یہاں پہنچے۔'' آواز کسی مرد کی تھی لیکن آواز میں کپکپاہٹ تھی۔''

تب تک بشیر احمد اور عارف تیسری منزل پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں ایک باوقار لیکن کمزور دبلا پتلا آدمی دروازے پر کھڑا ان کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی عینک درست کرر ہا تھا۔

'' آپ لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے۔ میں حیران ہوں ، کیا آپ ہیلی کوپٹر سے اتر آئے ہیں۔لیکن میں نے تو ہیلی کوپٹر کی آواز نہیں سنی'' وہ آدمی باتیں کرر ہا تھا اور بشیر احمد اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرر ہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جار ہا تھا۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی مل جائیں گے۔ امی کیسی ہے۔''

''امی۔۔۔امی ٹھیک نہیں ہے۔۔۔پر آپ۔۔۔آپ کون ہیں۔''

''آپ بہت زیادہ نروس ہیں ڈاکٹر علی۔ابھی آپ مجھے نہیں پہچانیں گے۔۔۔میں آپ اور امی کو یہاں سے لیجانے آیا ہوں۔''

''کیسے۔۔۔؟

''تیر کے۔''

''لیکن مجھے تیرنا نہیں آتا۔ میں نہیں تیر سکتا۔''

''تم خود تیر کے جاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ۔ پہلے میں پانی میں اتر جاؤں گا۔تم میرا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتر جانا۔ پھر میں تمہیں پار لے کر جاؤں گا۔ یہ میچ جیتنا ہے،ہم دونوں کو۔۔۔بس''

''بشا۔۔۔بشیر احمد۔۔۔''

ڈاکٹر علی کی چیخ نکل گئی۔بشیر احمد کا نام لینے کے بعد اس کی گھگی بندھ گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے مل کر دیر تک روتے رہے۔ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے رہے۔اور عارف کی آنکھیں خود بخود تر ہوتی جا رہی تھیں۔لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔۔۔

☆☆☆

مہمیز

میں آج پورے چار سال کے بعد اس کے روبرو بیٹھا تھا، اُسے دیکھ کر مجھے اپنی غربت اور کم مائیگی کا زبردست احساس ہو رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔شائید وہ میری سراسیمگی نوٹ بھی کر لیتا،لیکن جب سے میں آیا تھا، وہ لگاتار فون پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔ چائے کی چسکیوں میں خود کو الجھا کر مجھے سنبھلنے کا اچھا موقعہ مل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے آفس کا بھی اچھی طرح سے جائزہ لینے کا موقعہ مل رہا تھا۔۔۔ یہ آفس نہیں ایک بڑا ڈیکوریٹیڈ شوروم لگ رہا تھا۔فرش پر مہنگا کشمیری قالین بچھایا گیا تھا۔اُس پر قیمتی فرنیچر۔کمرے کی چھت اور دیواریں ختم بند پنلنگ سے سجے۔دیواروں پر قد آدم پینٹنگس۔کھڑکیوں پر ریشم کے دبیز پردے۔ایک طرف ڈینلوپ کے صوفے رکھے گئے تھے،جن کے نرم تکیوں پر کشمیری چین سٹچ کے غلاف چڑھے تھے۔مغل آرکیٹیکچر میں بنا دروازہ ۔دروازے کے پائیوں پر چڑھی عشق پیچان کی بیلیں جن کے سرخ اور نیلے پھول کمرے کا حسن دوبالا کر رہے تھے۔سامنے کھلی کھڑکی کے شیشوں کے اُس پار برف پوش پہاڑی سے گرتا آبشار ارد گرد کے ماحول کو رومان انگیز بنا رہا تھا۔۔۔کمرے میں ایک طرف بڑی آبنوسی میز سجائی گئی تھی،جس پر صرف دو فائل پڑے تھے۔اور میز کے پیچھے ریوالونگ چیر پر عرفان بیٹھا تھا۔۔۔عرفان کی شاندار شخصیت کو بلیک دھاری دار سوٹ اور اندر پہنی سفید کالر والی قمیض نے اور پُر وقار بنا دیا تھا۔

مجھے عرفان کا چہرہ تناؤ سے پُر اور کھنچا کھنچا سا لگ رہا تھا۔۔۔ یہ تناؤ مجھے اس کی ذہنی پریشانی اور دل کی اداسی کے سبب لگ رہا تھا۔اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر یہ

اداسی کیوں ہے ۔۔۔ وہ تاشی تھی ۔ جو چار سال پہلے اس کی زندگی میں بہار بن کر آ گئی تھی ۔ لیکن اُس کا وہ پیار صرف چار دن ہی رہا ۔ پھر اپنے ہاتھوں عرفان کا دل ویران کر کے چلی گئی تھی ۔

دو دہائیوں سے زیادہ مکدوش حالات کے بعد اب کشمیر کچھ کچھ سنبھل رہا تھا ۔ سیاح پھر سے کشمیر کا رخ کر رہے تھے ۔ پچھلے پچیس برسوں میں ہم کیا کچھ کھو چکے تھے ۔ اب اُس کا کسی کو غم نہیں تھا ۔ اگر کوئی غم تھا تو وہ بے کاری، بے روزگاری، غربت اور افلاس کا غم تھا ۔ میرا باپ گھوڑا بان تھا ۔ ہمارے پاس کئی خچر اور گھوڑے تھے ۔ جن کو لیکر میرا باپ پہلگام چلا جاتا تھا ۔ اور ایک سیزن میں پورے سال کا خرچہ کما لیتا تھا ۔ پھر سارے سیزن حالات کے شکار ہو گئے اور یہاں مستقلاً بس ایک ہی سیزن جم کر بیٹھ گیا ۔ جس میں ہم اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ۔ جب تک میرا بچپن گیا اور میں جوان ہو گیا، ہم اپنے سبھی خچر اور گھوڑے بیچ کر کھا چکے تھے ۔ اب گھر میں ہر طرف غربت، افلاس اور پریشانیاں ڈیرا ڈالے ہوئی تھیں ۔۔ حالات بہتر ہوئے تو ہم نے قرضہ لیکر ایک خچر خرید لیا اور میرا باپ اُسے لیکر پہلگام چلا گیا ۔ لیکن اب اس کی ٹانگوں میں وہ سکت نہ تھی کہ وہ بائیسرن جیسی پہاڑی پر سیاح کو لیکر جا سکتا، یا چندن واڑی تک گھوڑے کی لگام پکڑ سکتا ۔ آخر باپ کی ناتوانی اور گھر کی پتلی حالت نے مجھے مجبور کر دیا، اور میں اپنا اکلوتا خچر لیکر پہلگام چلا گیا ۔ کام اچھا چل نکلا تھا تو اگلے سال میرے پاس دو خچر تھے، اب ہمارے غموں کا کچھ کچھ مداوا ہو رہا تھا ۔۔۔ عرفان میرے بچپن کا دوست تھا ۔ میرے پڑوس میں رہتا تھا ۔ ان کے گھر کے حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے ۔ اس کا باپ بشیر احمد کبھی بازار میں ٹھیلہ لگاتا تھا ۔ لیکن جب یہاں کے حالات خراب ہو گئے ۔ روز روز ہڑتالیں، ہنگامے، گولیاں اور مار دھاڑ ہونے لگی، معصوم اور بے گناہ لوگ بلاوجہ مرتے گئے یا مارے گئے ۔۔ تو ایک دن کراس فائرنگ میں عرفان کا باپ بھی اپنی جان گنواں بیٹھا ۔ وہ اپنا ٹھیلہ

لے کر بھاگ رہا تھا، دکاندار دکانوں کے شٹر گرا رہے تھے۔گھر والے دروازے بند کر کے اندر سے لاک کر رہے تھے۔لوگ اپنا اپنا سامان اور سودا سلف چھوڑ کے بھاگ رہے تھے۔۔۔ دائیں، بائیں سے گولیاں چل رہی تھیں۔اسی بھاگ دوڑ میں ایک گولی بشیر احمد کو بھی لگی تھی۔ وہ کئی بار گرا اور اٹھا، اٹھ کر پھر گر جاتا تھا، وہ مدد کے لئے بہت چیخا، چلایا، پر کوئی مددگار نہ تھا۔۔ پیاس سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔وہ خون میں لت پت گھسٹتے گھسٹتے گٹر تک آ گیا تھا، جونہی اس نے اپنا ہاتھ گٹر میں ڈالا۔اس کے سر پر بندوق کا بٹ مارا گیا۔جسم میں باقی بچا خون فوارے کی طرح اوپر آ رہا تھا اور مٹی میں مل رہا تھا۔اس کی لاش خاک اور خون میں لت پت ہوگئی تھی اور ہاتھ کی انگلیاں گٹر کا پانی چھو رہی تھیں۔۔۔تب عرفان بہت چھوٹا تھا۔لیکن اس کی ماں نے ہمت نہیں ہاری، گائے کا دودھ بیچ کر گھر چلاتی رہی اور عرفان کو بھی پڑھاتی رہی۔ جب ہم محلے کے سارے لڑکے پڑھائی سے بھاگ رہے تھے، اور ہلکا پھلکا کام دھندا کرنے لگے تھے،عرفان یونیورسٹی جاتا رہا۔آج کل وہ ایم اے کا امتحان دے کر فارغ بیٹھا تھا،اور ریزلٹ کا انتظار کر رہا تھا، میں اس کو اپنے ساتھ پہلگام لایا تھا۔سوچا چند دن میرے ساتھ رہ کر مفت میں پہلگام کی سیر کرے گا۔۔۔عرفان تو جیسے پہلگام کا دیوانہ ہی ہوگیا تھا۔وہ صبح ہی صبح نالہِ لدر کے کنارے نکل جاتا تھا،اور بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے اور اچھلتے پانی کے تیز بہاؤ کا مزا لیتا تھا۔لدر کے کنارے سرسبز مخملی گھاس پر شبنمی قطرے سورج کی کرنوں میں چمکتے رہتے ہیں، وہ یہاں آ کر ننگے پاؤں دوڑتا رہتا تھا۔شام کے سرمئی رنگ میں دیوداروں کے لمبے سائے دلکش نظارہ پیش کرتے ہیں،اور ہوا کی خنکی جسم و جان میں نئی تازگی بھر دیتی ہے۔عرفان گھنٹوں یہاں بیٹھ کر جیسے پہلگام کی ساری مستیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں تھا۔۔۔دن میں ہم اپنے گھوڑوں پر ٹورسٹ گھماتے رہتے تھے،اور میں عرفان کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔۔۔

آج ساؤتھ انڈیا سے آئی ہوئی ایک بڑی فیملی یہاں کے تین ستارہ ہوٹل میں ٹھہری تھی، جن کو 12 گھوڑے چاہیئے تھے۔ ہم تین گھوڑے والے ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے عرفان کو بھی ساتھ لیا تھا۔ فیملی کا ہیڈ سری واستوا صحت مند آدمی لگ رہا تھا۔ جب وہ اپنے اپنے گھوڑے پسند کرنے لگے تو اس وقت پتہ چلا کہ صرف سری واستوا جی ہی ہندی بولتے ہیں، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی۔ باقی سارے لوگ انگریزی یا کوئی دوسری ہی زبان بولتے تھے۔۔۔ ویسے پہلگام کے سبھی گھوڑے والے دنیا کی لگ بھگ ساری زبانیں اپنے مخصوص اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بول ہی دیتے ہیں، لیکن ہم ابھی اناڑی تھے۔ ابھی گھوڑا بانی میں ہمارا یہ دوسرا ہی سال تھا، اب جو ہم پھنسے تھے، وہ بھی لڑکیوں اور بچوں کے بیچ میں برے پھنسے تھے۔ ہم ان کی باتیں سمجھ نہیں پا رہے تھے، اور وہ ہمارے اشارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔ ہم سبھی پریشان تھے، عرفان مزے لے رہا تھا، وہ لگاتار ہنستا جا رہا تھا اور مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ آخر اس کو ہماری لاچارگی پر ترس آ ہی گیا، تو اس نے شفاف انگریزی میں ان کے ساتھ بات چیت شروع کر دی، وہ ان کو کشمیر کے بارے میں اور خاص طور سے پہلگام کے بارے میں ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح جان کاری دے رہا تھا۔ اور میرا سینہ فخر سے پھولتا جا رہا تھا، میں اپنے گھوڑے بان ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ میرا دوست بہت پڑھا لکھا ہے اور قابل بھی ہے۔۔۔

''ابھی آپ نے پہلگام میں دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی آپ شکارگاہ کہاں گئے، بائسرن، آڑو، چندن واڑی، بے تاب ویلی اور گوالف کورس کہاں دیکھا ہے۔۔ ابھی آپ نے لدر کے اچھلتے پانیوں میں کھڑے ہو کر فوٹو کہاں کھنچوائے ہیں۔۔۔ دیوداروں کی بھینی بھینی خوشبو سے محظوظ کہاں ہوئے ہیں۔'' عرفان نے ان کو پہلگام کی ایسی ایسی تعریفیں بتا دیں کہ بچوں اور لڑکیوں نے اپنے پہلگام کے پروگرام میں مزید تین دن بڑھا دیئے۔

اب باتوں باتوں میں یہ پتہ لگ چکا تھا کہ سری واستوا کے ساتھ اس کے دو بیٹے آشوتوش اور مانو، دو بہوئیں ریتو اور سرلا، اس کی ٹڈل ایج بیٹی راشی (جس کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہو چکی تھی) کے علاوہ بڑے بیٹے آشوتوش کی تین جوان بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے مانو کے دو بچے ساتھ تھے۔ان کے علاوہ چالیس پنتالیس سالہ ان کا نوکر تھا۔سری واستوا وہاں کا بڑا بزنس مین تھا، اور اسکے دونوں بیٹے سافٹ ویر کمپنی چلا رہے تھے۔تین بہنوں میں منجھلی بہن کا عجیب سا نام تھا''تاشی''۔ایسے نام اکثر چینی یا جاپانی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔تب ان کی ہی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ جس دن یہ پیدا ہوگئی تھی، اسی دن اس کے باپ کو ایک بڑا سافٹ ویر حاصل کرنے میں کامیابی مل گئی تھی، سافٹ ویر کا نام تاشی تھا۔اس لئے انہوں نے اپنی اس بیٹی کا نام اسی سافٹ ویر کے نام پر تاشی رکھ دیا تھا۔۔۔

''ہمارے گھر میں بوا کی حکمرانی چلتی ہے۔یہ جو کچھ کہے گی وہی بنے گا'' یہ بات تاشی نے اپنی بوا راشی کے بارے میں کہی تھی۔۔راشی اپنی بھائیوں کی چہیتی اور لڑکیوں کی دوست لگ رہی تھی۔تاشی گھر کی لاڈلی تھی، تینوں بہنوں میں سب سے خوبصورت، ذہین اور بے باک تھی۔وہ عرفان کے بہت قریب جارہی تھی۔۔۔ بلا وجہ ہی عرفان سے سوال پوچھتی رہتی تھی، کشمیر کے بارے میں طرح طرح کی جانکاری حاصل کرنے کے بہانے عرفان کے ساتھ چمٹی رہتی تھی۔راشی اور مانو بھی سوالات پوچھتے رہتے تھے، لیکن مانو کی باتیں زیادہ تر بزنس کے بارے میں ہوتی تھیں، جہاں عرفان کورہ تھا، کورہ تو عرفان ان کے بچوں کے سامنے بھی لگتا تھا۔جتنا وہ جدید ٹیکنالوجی کے قریب تھے عرفان اتنا ہی اُس سے کوسوں دور تھا۔وہ بچوں کے سامنے بہت زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہو رہا تھا۔لیکن تاشی اُسے خفت اٹھانے کا موقعہ نہیں دیتی تھی۔تاشی کے سپورٹ میں بُوا بھی ساتھ ساتھ رہتی تھی۔۔۔۔

''یار یہ لڑکی تو تمہاری دیوانی ہی ہوگئی ہے۔تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے۔'' یہ

بات میں شام کی نون چائے پیتے پیتے عرفان کو بتا رہا تھا۔ جب ہم ڈیرے پر واپس آ گئے تھے۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے حامد ڈیر۔ یہ بہت امیر لوگ ہیں۔زیادہ دن یادنہیں رکھیں گے۔بس جب تک یہ لوگ پہلگام میں ہیں۔۔، پھر یہ کہاں اور ہم کہاں۔'' عرفان نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

''لیکن میں نے تاشی کی آنکھوں میں تیرے لئے ایک عجیب سی کشش دیکھی ہے۔ وہ جب بھی تیری طرف دیکھتی ہے۔اس کی آنکھوں میں مجھے تیرے لئے ڈھیر سارا پیار نظر آتا ہے۔''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں کہتا ہوں پٹاؤ اس کو۔ یہ بڑے امیر لوگ ہیں۔ پیسے والے ہیں۔تیرے دن بدل جائیں گے۔'' میں نے زوردار قہقہہ لگاتے کہا۔

'' آسان نہیں ہے یار۔ پیسہ اتنی آسانی سے کہاں ملتا ہے'' عرفان نے لنگڑی گھوڑی کے ہارے ہوئے مالک کی طرح کہا، جس کی گھوڑی کو تیز طرار ٹورسٹ ریجکٹ کر کے دوسرے کے خچر پر سواری کرتا ہے۔مجھ سے اس کی یہ ناامیدی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے اس کی ہمت بندھانے کے لئے کہا۔

''بہت آسان ہے میرے بھائی۔بس انسان کو موقعہ ملنا چاہئے۔جس طرح تم کو مل رہا ہے۔۔۔کم سن باقرہ اور ننگ گھوڑی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔پٹایا اور بس۔۔۔ میں بتا تا ہوں کیسے۔۔۔گھوڑی کو پہلے پیار سے سدھاؤ۔۔ پھر دمچی کس لو۔۔اوپر زین ڈال دو۔۔ اپنے پیر رکابوں میں پھنسادو۔۔ پھر مہمیز لگادو۔۔۔ اب گھوڑی سرپٹ دوڑے گی۔۔۔پر میری ایک اور بات بھی یاد رکھنا۔لگام اپنے ہاتھ میں کس کے رکھنا۔پھر گھوڑی کو

جدھر موڑنا چاہو گے، وہ مڑتی جائے گی۔۔۔سوار جتنا اچھا اور تجربہ کار ہوتا ہے، اس کی گھوڑی اُتنی ہی مست رفتار سے دوڑتی رہتی ہے۔۔۔''

وہ ساری رات عرفان کے سپنوں کی رات تھی۔۔۔تاشی ایک پل کے لئے بھی اس کے سپنوں سے ادھر اُدھر نہیں گئی تھی۔ وہ ساری رات تاشی کے ساتھ چندن واڑی کی برفیلی پھسلن پر پھسلتا جا رہا تھا۔کبھی وہ آڑو کے گھنے دیوداروں کے بیچ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بے تاب ویلی کی مخملی گاس پر خراماں خراماں چہل قدمی کر رہے تھے۔لدر کے کنارے اچھلتی لہروں سے کھیلتے جا رہے تھے۔تاشی نے ایک پل بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔۔۔صبح جب وہ دیر تک نیند سے نہیں جاگا تو میں نے اُسے زبردستی اٹھا دیا۔وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بتا دیا کہ وہ میری باتوں اور تاشی کے خیال سے رات بھر سو نہیں پایا تھا۔

آج وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ میں عرفان کو ساتھ لیکر ہوٹل پہنچ گیا، میرے ساتھ میرا گھوڑا تھا۔وہ گاڑیوں میں سامان لادرہے تھے،عورتیں سامان چیک کر رہی تھیں۔

''عرفان تم! اس وقت؟'' بوا نے عرفان کو دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا، تو سبھی کا دھیان ہماری طرف گیا۔ وہ سبھی ہم کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔۔لیکن عرفان کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔۔۔

''وہ کیا ہے کہ عرفان آپ لوگوں کے لئے کچھ گفٹس لایا تھا۔۔ارے عرفان دے دونا۔۔'' عرفان جو تاشی کو اداس نظروں سے دیکھ کر نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ میرے بُلانے پر ہچکچا رہا تھا۔ پھر جلدی جلدی گھوڑے سے سامان اتارنے لگا۔ میں نے بھی اس کی مدد کی۔ہم نے ان کو سیب کی دو پیٹیاں، کچھ اخروٹ اور بادام دے دیئے۔ وہ بہت زیادہ خوش ہو گئے تھے۔۔۔انہوں نے ان چیزوں کے پیسے دیئے تھے۔جو ہم نے واپس کر دیئے۔۔۔جب تک باقی لوگ گاڑیوں میں بیٹھنے لگے، تاشی اور بوا عرفان کے قریب ہی کھڑے اس کے

ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔۔۔۔۔

عرفان نے اچھے نمبروں کے ساتھ MA پاس کیا، اور مذید پڑھائی کے لئے ریاست سے باہر چلا گیا۔ان دنوں پہلگام میں سیاحوں کا کافی رش رہتا تھا،اسلئے میں عرفان سے مل نہیں سکا تھا۔۔ یہ اگلے سال کی دلکش صبح تھی جب مجھے ہوٹل تھری سٹار سے بلاوا آیا۔۔۔اکثر ایسا ہوتا ہے،کوئی پچھلے سال کا سیاح اگر نئے سال پھر گھومنے آجاتا ہے تو زیادہ تر وہ پرانی جگہ ہی رہنا پسند کرتا ہے،اور وہ اکثر ان ہی گھوڑے بانوں کو بلاتے ہیں،جن کے ساتھ وہ پچھلے سال گھومے ہوں۔میں بھی یہی سوچ کر جا رہا تھا کہ شاید کوئی پرانی پارٹی پھر سے گھومنے آئی ہے۔ ہوٹل پہنچ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں بُوا کو دیکھا۔ پھر تاشی اور اسکا بے ڈھنگا شوہر۔سب لوگ میرے ساتھ بڑے تپاک سے ملے۔ پھر بُوا نے تعارف کرایا۔

''یہ ارجن ہے،تاشی کا ہسبنڈ'' جب ارجن نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔میرے اندر کہیں سے بہت بڑا اچھنا کا سا ہوا۔ میرے اندر بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہوگئی۔سامنے عرفان کا اداس اور بے بس چہرہ آگیا۔۔۔آج پھر غریب کی محبت ہار چکی تھی۔۔۔آج پھر نادار اور مفلس کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔۔۔۔میں اپنے غریب دوست کے لئے بہت اداس تھا ۔۔۔بہت زیادہ غمگین تھا۔۔۔۔۔

میں ان کو پورا پہلگام گھماتا رہا۔۔۔تاشی ارجن کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھی ۔۔۔ہنسی کی کلکاریاں بھر رہی تھی۔۔ ہرنی کی طرح اچھل کود کر رہی تھی۔۔لدر کے کنارے ارجن کے کندھے پر اپنے بال بکھرا کر ویڈیو بنوا رہی تھی۔۔۔اس نے ایک بار بھی مجھ سے عرفان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔جس وجہ سے مجھے اس پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ میں پھنکار رہا تھا

''ہنہ بڑی آئی کالی گھوڑی۔۔۔!'' وہ پہلگام میں دو دن گھومتے رہے۔ جگہ جگہ فوٹو کھچوائے، ویڈیوز بنوائے، اور مجھے اچھا خاصا پیسہ دے کر چلے بھی گئے۔۔۔لیکن مجھے ان کے آنے یا ان کے جانے سے کوئی مسرت نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ وہ مجھے بہت زیادہ غمزدہ کر کے چلے گئے تھے۔۔۔میرا دوست عرفان جانے کہاں تھا۔ کیا خبر وہ تاشی کی بے وفائی سے آشنا تھا بھی، کہ نہیں۔۔۔

ابھی چند دن پہلے ہی مجھے پتہ چلا ہے کہ عرفان نے ہوٹل گرین راج خریدا ہے۔ میں حیران تھا، لیکن خوشی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ یہ سب تاشی نے کیا ہے۔ اب شاید تاشی کو یہ احساس ہوا ہوگا کی عرفان کو دھوکہ دے کر اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔ عرفان کی مدد کر کے اس نے اپنے پیار کا قرضہ چکایا ہوگا۔۔۔۔کچھ تو میرے دل کو ٹھنڈک مل رہی تھی۔

آج میں عرفان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہم نے چائے بھی پی لی، لیکن وہ پریشان تھا۔۔۔وہ لگاتار فون کر رہا تھا اور کسی کو ہدایت دیتا جا رہا تھا۔۔۔اس کی باتوں سے میں اتنا جان چکا تھا کہ کوئی میڈم ائیرپورٹ سے آ رہی ہے۔ ہوٹل کی گاڑی اسے لانے گئی ہے، جو پہلگام کے نزدیک پہنچ کر ٹرافک جام میں پھنس چکی ہے۔ میں نے عرفان کی آنکھوں میں چمک سی دیکھی، وہ دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھلا۔

''ہائے ڈارلنگ'' کہہ کر جو اندر آ گئی، اس کو دیکھکر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ عرفان کے گلے لگ گئی۔۔۔عرفان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ دونوں میری طرف آ رہے تھے، اور میں ہکا بکا انہی کو دیکھ رہا تھا۔۔

''ہائے حامد کیسے ہو''

''یُو ا۔۔۔!''میں ابھی شش و پنج میں ہی تھا۔

''بُوا نہیں حامد میاں۔ یہ تیری بھابی ہے'' عرفان کا چہرہ پُر جوش لگ رہا تھا، اور اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھمک رقصاں تھی۔

''بھابی۔۔۔۔!'' میں حیران و پریشان ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔اور وہ دونوں بڑی شوخی کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔میں حیران تھا، یہ پینتالیس سالہ بُوا اور تیس سال کے نوجوان عرفان کو کس نے ایک بندھن میں باندھ دیا ہے۔میرے دل میں بُوا کے خلاف بری بری باتیں آ رہی تھیں۔

''ہنہ۔! بوڑھی گھوڑڑڑڑڑ'' پر تبھی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔۔۔۔ میرا دوست اس بڑے ہوٹل کا مالک اسی بُوا کی وجہ سے بن چکا تھا۔۔۔ مجھے تاشی کی وہ پہلی بات یاد آ رہی تھی۔جو شاید عرفان نے بھی اپنی ذہن کی جیب میں گرہ باندھ کے رکھ لی تھی۔۔

''گھر میں بُوا کی حکمرانی چلتی ہے۔یہ جو کہے گی وہی بنے گا۔'' ۔۔۔تبھی تو تو تو تو !!!۔۔۔۔اب مجھے بھی بُوا تاشی سے زیادہ جوان اور خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔۔

☆☆☆

قرعہ فال

حالات روز نئی کروٹ لے رہے تھے۔ نئے نئے رنگ اور نئے نئے روپ میں سامنے آرہے تھے اوراب آہستہ آہستہ سارے رنگ پھیکے پڑتے جارہے تھے۔ حالات کے ساتھ ساتھ جیسے سارے موسموں کے رنگ بھی ایک ہی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ جیسے موسم کے ہر رنگ پر سیاہی پھرتی جارہی تھی۔ پھر نہ رنگوں کی اصل پہچان ہی قائم رہ پائی تھی اور نہ وہ لوگ ہی باقی رہے تھے، جو صحیح رنگوں کی پہچان رکھنے والے کہلاتے تھے۔ پانچ سو سالہ غلامی کا طوق ۔۔۔۔افففف ۔وہ سب اب قصہء پارینہ لگ رہا تھا۔۔۔

طارق کی شادی ہوگئی تو اس کے بڑے بھائی نے اس کو اپنے سے الگ کر دیا۔ان کے ماں باپ پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ یہ بات طئے تھی کہ اس کی شادی کے بعد ہی دونوں بھائی گھر کا بٹوارا کریں گے۔لیکن طارق کو اس کی کوئی پروانہ تھی۔ وہ اچھا کاری گر تھا، قالین بافی میں ماہر تھا۔ اس کی بیوی صفیہ نے بھی طارق کے پاس بیٹھے بیٹھے قالین بافی کے کچھ گُر سیکھ لئے تھے۔ وہ شوہر کے لئے اون سمیٹتی تھی۔رنگوں کو الگ الگ ترتیب سے رکھ دیتی تھی۔ طارق کو کب کونسا رنگ چاہئے وہ نکال کے رکھ دیتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ گھر کا خرچہ اچھا چل رہا تھا اور پانچ سال میں دو بیٹیاں بھی ہوگئیں تھیں۔۔۔ پھر دس سال سے چلے آرہے نامساعد حالات کی وجہ سے کشمیر کا ہنڈی کرافٹ زوال پذیر ہونے لگا تھا۔خسارے کی وجہ سے بڑے بڑے کارخانہ داروں نے ہاتھ روک لئے تھے۔ ان کا تو کچھ زیادہ نقصان بھی نہیں تھا۔ انہوں نے یہاں اپنا کاروبار بند کر دیا اور دوسرے بڑے شہروں میں جا کر نیا بزنس شروع کر دیا۔ اگر کوئی حالات کا شکار تھا تو وہ کشمیر کا غریب کاری گر

تھا۔ طارق کے بھی برے دن شروع ہوگئے تھے۔ کام نہ ملنے کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ پھر کبھی مزدوری، کبھی رنگ سازی، کبھی گلکاری تو کبھی دوسرا کوئی کام۔ غرض اس کے حالات میں کوئی سدھار نہیں آ رہا تھا۔۔۔ آج کل وہ کچھ دنوں سے مغرب کی نماز کے بعد کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر دیر سے گھر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ پوری رات ہی باہر رہنے لگا تھا اور صفیہ انتظار کرتی رہتی تھی۔ پھر آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی اور اب اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔۔۔ تب ایک دن غصے میں طارق نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میں اپنے آپ کو قوم کے لئے وقف کر رہا ہوں۔ میں جا رہا ہوں''

''کہاں؟؟؟'' صفیہ ہکا بکا ہو کر رہ گئی۔۔۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

''اپنی قوم کو آزادی دلانے''

''اور ہماری بیٹیوں کا کیا بنے گا؟'' صفیہ دونوں بیٹیوں کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی، اور بیٹیاں خاموشی سے ان دونوں کو تک رہی تھیں۔۔

''ان کا خدا ہے۔'' صفیہ آنکھیں پھاڑے طارق کو دیکھ رہی تھی۔ جھولے پر لٹکے آدھے بُنے رنگ بہ رنگے قالین کے سارے رنگ جیسے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سفید، سرخ، نیلا، پیلا اور لاجوری رنگ جیسے ایک دوسرے میں ضم ہو رہے تھے اور یہ سارے رنگ کسی گہری سیاہی میں ڈوب رہے تھے۔ یہی سیاہ رنگ صفیہ کے آنکھوں کے سامنے اپنے سیاہ ہالے جیسے بن رہا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ کو دھندلی نظروں سے چیرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ بولی۔

''اور میرا؟'' اُسے لگ رہا تھا جیسے طارق ابھی گرم گرم سیسہ پگلا کر اس کے کانوں میں ڈال دے گا۔ اور وہی ہوا بھی۔

''اب تم میری راہ میں روڑے بچھا رہی ہو۔ میں نے کہا نا میں نے خود کو قوم کے

لئے وقف کر دیا ہے۔'' صفیہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔۔۔

''اب بس۔۔اب میں تمہاری کچھ بھی نہیں سنوں گا۔'' پھر اس نے واقعی صفیہ کی ایک نہ سنی، صفیہ نے اس کو اپنی بیٹیوں کا واسطہ دے دیا۔ اس کے پیر پکڑ لئے۔ لیکن اس کو جانا تھا۔ وہ صفیہ اور اپنی دونوں بیٹیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔اور آج گولیوں سے چھلنی اس کی لاش پولیس گاڑی نے اس کے آنگن میں پھینک دی تھی۔ لوگوں کا ہجوم اُمڈ آیا تھا۔ صفیہ اور اس کی دونوں بیٹیاں لاش پر بین کر رہی تھیں۔ پڑوس کی عورتیں انہیں سنبھال رہی تھیں پر وہ سنبھالے سے بھی سنبھل نہیں پا رہی تھیں۔۔۔ بڑی مشکل سے لوگ ان کے ہاتھوں سے میت چھین کے لے گئے تھے۔۔۔۔ میت کے پیچھے ایک جمِ غفیر تھا۔ سارا ماحول نعروں سے گونج رہا تھا۔

''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔''

لوگوں نے جنازہ پوری بستی میں گھومایا۔ جگہ جگہ لوگ جنازے پر گل باری کر رہے تھے۔ نعرہ بازیاں ہو رہی تھیں، آخر بڑی دیر کے بعد جنازہ قبرستان پہنچا اور میت کو دفنا دیا گیا۔۔۔ پھر چار دن تک صفیہ کے گھر میں لوگوں کا بڑا آنا جانا لگا رہا۔ آنگن میں ایک بڑا سا شامیانہ کھڑا کر دیا گیا۔ جس میں لاوڈ اسپیکر لگا دیا گیا۔ مقررین تقریریں کر رہے تھے۔ طاغوتی نظام کو ختم کرنے کی حوصلہ بخش باتیں اور شہیدوں کے بلند درجات کے بارے میں خطبہ جات لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر رہے تھے۔ طارق کی موت کو بڑی مقدس قربانی کے طور یاد کیا جا رہا تھا۔ اور صفیہ کے لئے اسے اجرِ عظیم کہا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے زعماً اور ہمدرد آ رہے تھے۔ کوئی صفیہ کو مقدس کتاب کے نسخے دے رہا تھا، کوئی پند ونصائح۔ تو کچھ دوسری نادر کتابیں دے رہے تھے۔ اور ان چار دنوں میں اس کے پاس کتابوں کے ڈھیر جمع ہو گئے تھے۔۔۔ پھر چوتھے کے بعد نہ کوئی آیا اور نہ کوئی گیا۔ شاید سبھی

لوگ سمجھتے تھے کہ کچھ کتابیں دے کر اور رٹی رٹائی تقریریں کر کے انہوں نے اپنا فرض پورا کرلیا ہے۔اوراب صفیہ انہی خیالی باتوں کا پلاؤ پکا کر ساری عمر اپنی بیٹیوں کو کھلاتی رہے گی ۔۔البتہ بعد میں کچھ لوگ آنے لگے تھے،جنہوں نے گھر میں ہی ڈیرہ ڈالنا چاہا تھا۔وہ خود کو طارق کے ساتھی کہہ رہے تھے۔لیکن صفیہ نے ان کو گھر آنے سے دوٹوک منع کر دیا۔

''جب اس گھر میں اب تم لوگوں کا ساتھی ہی نہیں رہا تو پھر تمہارا یہاں کیا کام۔''

آنے والے سمجھ گئے کہ صفیہ نے ان پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔۔۔پھر کسی نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ صفیہ نے اپنا اور اپنی بیٹیوں کا پیٹ کس کسم پرسی میں پالا ہے۔

پھر یہاں روز کسی نہ کسی نئی بات پر ہنگامے ہوتے رہے۔۔۔ لوگ مرتے گئے یا مارے گئے ۔۔حالات میں سدھار کم آ رہا تھا اور بگاڑ زیادہ ہو رہا تھا۔۔۔آج پندرہ سال بعد شہر میں ایک نیا ہی ہنگامہ شروع ہو رہا تھا۔۔۔یہ ہنگامہ صفیہ کے گھر تک پہنچ چکا تھا۔۔لوگ اس کے گھر پر پتھراؤ کر رہے تھے۔کچھ توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور کچھ گھر کے شیشے توڑ رہے تھے۔صفیہ باہر آ گئی تو اس کے سر پر بھی ایک پتھر لگ گیا۔ وہ وہیں گر گئی۔اس کی بیٹیاں بڑی مشکل سے اُسے کھینچ کر گھر کے اندر لے گئیں تھیں۔۔۔آخر پولیس آ گئی،انہوں نے ہوا میں فائر بھی کھولا لیکن جب حالات قابو میں نہیں آئے تو اپولیس نے تینوں ماں بیٹیوں کو گاڑی میں ڈالا اور پولیس سٹیشن لے گئے۔

صفیہ پر الزام تھا کہ وہ اور اس کی بیٹیاں کافر ہو گئی ہیں،اور وہ اپنے گھر میں فحاشی کا اڈا چلا رہی ہیں۔جس کے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ پائی تھی کہ محلے کے یہ چند آسودہ حال لوگ مدد کی آڑ میں اس کے ساتھ چوری چھپے غلط مراسم رکھنے کا شوق رکھتے تھے۔جب اس نے انکار کیا تو انہوں نے اس کی مدد کرنے سے ہاتھ روک لیا۔تب ایک مشینری اسکول نے

اس پر ترس کھا کر اپنے اسکول میں چپراسی کی نوکری دے دی اور اس کی دونوں بیٹیوں کو مفت تعلیم فراہم کی۔اب یہ لوگ اپنا غصہ نکالنے کے لئے اس پر الزام لگا رہے تھے۔

ابھی بھی پورا شہر آگ میں جل رہا تھا۔اور سرکار پریشان تھی۔وہ کسی بھی طرح شہر میں امن وامان قائم کرنا چاہتے تھے۔ورنہ ان کی حکومت گر جانے کا خدشہ تھا۔جو وہ کسی بھی قیمت پر ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔آخر ہائی کمانڈ کی میٹنگ بلائی گئی۔سبھی وزرا، سیول اور فوجی آفیسران گفت شنید میں لگے تھے۔سبھی لوگ شہر میں امن وامان قائم کرانے کی تدابیر کر رہے تھے۔اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے اور آخر کار بڑے سوچ بچار کے بعد مسئلے کا حل نکالا گیا جسے اب زمینی سطح پر صرف عملانا باقی تھا۔۔۔

اگلے دن سارا شہر پھر ہنگاموں کی زد میں تھا۔جگہ جگہ راستے بند کر دیئے گئے تھے۔گاڑیاں اور سرکاری عمارتیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔صفیہ کے گھر پر پھر سے پتھراؤ شروع ہوگیا تھا۔شیشے چکنا چور ہو رہے تھے۔کھڑکیاں دروازے توڑے جا رہے تھے۔۔پھر مجمع میں کوئی چلایا۔

''اس گھر کو آگ لگادو۔ان کافروں کو گھر میں ہی جلادو'' کچھ جذباتی بچے مجمع سے نکل آئے،ان کے ہاتھوں میں جلتی مشالیں تھیں۔وہ جوش میں گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔انہوں نے گھر میں آگ لگادی۔دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان سے بلند ہونے لگے۔۔بچے سیٹیاں بجا رہے تھے،اور عورتیں تالیاں۔البتہ مردوں کے چہروں پر کچھ تشویش ضرور تھی،اور وہ تشویش بھی صرف اتنی تھی کہ یہ آگ کہیں ان کے گھروں تک نہ آجائے۔ پولیس آئی،لاٹھی چارج ہوا۔گولی چلی۔ایک مرا۔دس بیس زخمی ہوگئے۔۔۔صفیہ کے گھر کے شعلے جتنے بلند اور تیز ہو رہے تھے۔شہر کی آگ اتنی ہی تیزی کے ساتھ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔۔۔

اب لوگوں کا غصہ اُتر چکا تھا۔وہ بدلہ لے چکے تھے۔اگلی صبح تک شہر کے حالات

میں کچھ کچھ بہتری بھی آ چکی تھی۔سرکار نے احتیاتی تدابیر کے طور شہر میں کرفیو لگا دیا تھا۔سرکار خوش تھی۔ان کا مشن کامیاب ہو چکا تھا۔۔۔تب پتہ چلا کہ ہائی کمانڈ میٹنگ میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ شہر کی آگ بجھانے کے لئے کسی غریب کا گھر جلانا ضروری ہے۔اور قرعئہ فال صفیہ کے نام نکل آیا تھا۔۔۔

☆☆☆

ضدی

میری ماں کے چہرے پر یاس اور ناامیدی کا پہرا تھا۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔اس کا چہرا بتا رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتی ہے۔لیکن ضبط کئے ہوئے تھی۔اس نے دل پر صبر کا کاغذی پتھر رکھا ہوا تھا۔اور کلیجے کو امید کے نحیف ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔وہ میرے چہرے کو ایک ٹک تکتی جا رہی تھی شاید میرے دل میں چھپے غموں کا طوفان میری آنکھوں میں تلاش کر رہی تھی۔وہ منتظر تھی کہ کب میرے صبر کا پیمانہ ٹوٹ جائے اور میں چیخ چیخ کر رو پڑوں۔وہ میرا سر اپنی گود میں رکھ کر اپنی پلکوں کا نرم باندھ کھول کر میرے ساتھ ساتھ زار و قطار رو لے۔تا کہ میرے درد کا کچھ مداوا ہو جائے۔لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں کی آنکھیں میرے دکھ کی وجہ سے تر ہو جائیں۔اپنی ماں کے ایک ایک آنسو پر ایسی ہزار جانیں قربان کر سکتا تھا۔

ایک سانحہ تھا جو مجھ پر گزرا تھا۔یہ سانحہ چھوٹا موٹا بھی نہیں تھا۔کسی اور پہ گزرتا تو وہ ٹوٹ پھوٹ کے بکھر کر رہ جاتا۔لیکن میں خود کو ٹوٹنے سے روکے ہوا تھا۔میں کتنا مجبور تھا، بے بس تھا اور بے آسرا بھی، یہ میں ہی جانتا تھا۔میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں بہت کمزور اور خوف زدہ ہوں۔لیکن مجھے خود کو بہت بہادر ظاہر کرنا تھا۔میری ذرا سی کمزوری میرا خوف عیاں کر دیتی۔اور میں روئی کے گالوں کی طرح بکھر کے رہ جاتا۔

یہ پہلگام وادی میں ڈوبتے سورج کا منظر تھا۔نالہ لدر کا اچھلتا پانی سورج کی سنہری کرنوں میں موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔لدر کے کنارے نرگس کے پھول بہار کی مست ہواؤں سے جھوم رہے تھے۔ان کی خوشبو ہوا کو معطر بنا رہی تھی۔میں قدرت کے اس

حسین نظارے میں کھو چکا تھا کہ روحی کا ہاتھ میرے کندھے سے سرکتا ہوا اب میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔ میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ میں جیسے کھو چکی تھی۔ ایک ٹک میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ڈوب کے میری آنکھوں کی گہرائیوں میں کچھ کھوج رہی تھی۔

''روحی۔ کیا کھوج رہی ہو۔۔۔''

''خود کو۔۔۔'' اس نے بنا پلک جھپکائے کہا

''کہاں۔۔۔ میری آنکھوں میں۔''

''نہیں۔۔۔ تیری روح کی گہرائیوں میں۔'' وہ سحر زدہ لہجے میں بول رہی تھی۔

''میری روح میری آنکھوں میں کب اُتر آئی ہے۔ جو تم اُسے یہاں تلاش کر رہی ہو۔''

''آنکھیں کبھی دھوکہ نہیں دیتی۔ آنکھوں سے ہمیشہ سچ میں سچائی اور جھوٹ میں جھوٹا پن مترشح رہتا ہے۔ پسند یا ناپسند کا اظہار تو آنکھیں جھپکنے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ خوشی اور غم بیاں کرنے کی ادا کوئی آنکھوں سے سیکھ لے۔ آنکھوں سے من کے اندر تک جھانکا جا سکتا ہے۔ روح کی گہرائیوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ بس چاہنے والے میں دیکھنے کی چاہ ہو۔''

وہ بول رہی تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے محبت کے سارے دیوی دیوتا اس کے بدن میں حلول کر گئے ہوں اور وہ میرے من، میری روح کے ساتھ ساتھ میری رگ و جاں میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ اور میرے محبت کے بند کواڑوں کو ایک ایک کر کے اکھاڑتی جا رہی ہے۔

''اب میرے من میں اتنا بھی نہ ڈوب جا کہ میری زندگی کے سارے سراغ ایک ایک کر کے وا ہو جائیں۔ کچھ راز تو راز ہی رہنے دو نا۔''

''میں تیرے ایک ایک راز کو کھولنا چاہتی ہوں۔ تیرے سارے راز کھلے اوراق کی طرح میری آنکھوں کے سامنے بکھرے پڑے رہیں تو میں دیکھ لوں کہ تم کتنا میرا ہو کر رہو گے۔ میری کتنی سنو گے۔ میرے بغیر بھی جی تو نہیں لو گے۔''

''یعنی سدا تیری انگلیوں پر ناچتا رہوں۔'' میں نے از راہِ مذاق کہہ دیا اور اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

''ہاں۔۔۔سو فیصدی ہاں۔''

''اب بس بھی کرو روحی۔ شام ہوگئی ہے۔ واپس گھر بھی پہنچنا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ اس کی مخروطی انگلیوں سے کھیلنے لگا کیونکہ مجھے اس کی آنکھوں سے وحشت سی برستی نظر آ رہی تھی۔ جیسے یہاں کی ساری بدروحیں اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہوں۔

روحی اور میں صبح ہی پہلگام کی سیر کرنے آئے تھے۔ لنچ کرنے کے بعد ہم نے پہلگام کی ساری خاص جگہیں دیکھ ڈالی۔ پوش ون پارک سے۔ بائسرن، بے تاب ویلی، شکارگاہ، اور اب آڑو جانے والے راستے پر بنے چھوٹے چھوٹے باغ باغیچوں کی سیر ہو رہی تھی۔ یہ پھولوں سے بھرے باغیچے لدر کنارے بنے ہیں۔ یہاں ایک طرف دیودار سے بھرے جنگل ہیں اور ایک طرف لدر کا اچھلتا پانی ہے جو بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا، شور مچاتا بہہ رہا ہے۔ یہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ پانی سے کھیلنا، پتھروں پر بیٹھ کر ٹھنڈے پانی میں پیر ہلانا، فوٹو گرافی کرنا، اچھے اچھے کھانے کھانا، جیسے وازوان، اور وازوان میں رستہ، گوشت آبہ، کرمہ، کباب۔ بس عید ہوتی ہے یہاں ہر روز۔

روحی یونیورسٹی میں میری جونیئر تھی۔ لیکن پیار میں میری سینئر۔ اسی نے میری طرف پیار کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ پہلے تو میں بہت ہچکچایا تھا۔ اس کے ساتھ پیار کرنا میرے لئے

مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بات تھی ۔ میں اس کے باپ کو جانتا تھا۔ یہ ہمارے پاس والے گاؤں کا نو دولتیا مغرور انسان تھا۔ رشوت خوری اور جعلسازی سے بہت پیسہ کمایا تھا۔ زمین جائیداد اور سیبوں کے کئی باغ بھی خرید چکا تھا۔ لالچی بھی بہت تھا اور تمیز و تہذیب سے بالکل کورا تھا۔ نک چڑھا اور گھمنڈی بہت تھا۔لیکن چالاک بھی بہت تھا۔ ہر مسلک کی مسجد میں سب سے زیادہ فنڈ دیتا تھا۔لوگ اس کے خلاف برا بولتے رہتے تھے۔لیکن کبھی کسی مذہبی ادارے کے لئے مالی معاونت ہو یا نئی مسجد کی سنگ بنیاد ڈالنی ہو۔اس وقت منتظمین اسی کے گھر کی طرف دوڑ لگاتے تھے۔ یہ سب کا ماننا تھا کہ اسی کے بل بوتے پر نئی مسجدوں یا اداروں کی سنگ بنیاد رکھی جاتی تھی۔ حج عمرہ ہر سال دو سال میں کرنے جاتا تھا۔لیکن کسی شخص کی ذاتی مدد کبھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے کتنے ہی رشتہ دار اور غریب پڑوسی غربت میں زندگی گزار رہے تھے۔لاکھ منت سماجت کرنے پر بھی ان کی مدد نہیں کرتا تھا۔بس وہی کام دل کھول کر کرتا تھا جس میں تشہیر کا امکان نمایاں ہوتا تھا۔

میں بہت ہی غریب ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہمارے پاس گزارے کے لئے تھوڑی سی زمین تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔لیکن میرے گاؤں کے سبھی لوگ میری غریب ماں کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ جن کے کھیتوں یا گھروں میں کام کرتی تھی۔ وہ اسے دل سے مزدوری کے پیسے دیتے تھے۔ میرے گاؤں میں میری ماں کی وجہ سے سبھی لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ اور میری پڑھائی میں میری مدد بھی کرتے تھے۔

میں نے روحی سے کئی بار کہا۔

’’روحی یہ کچے چھپر اور تین مالے بنگلے کا پیار زیادہ دیر پھل پھول نہیں سکتا۔ یہ کٹی پھٹی جیب نوٹوں سے بھری تجوری کے سامنے ٹک نہیں سکتی۔‘‘

’’رہنے دے۔ مجھے اب یہ ٹاٹ اور مخمل والے ڈائیلاگ نہ سنا۔ بہت سن چکی میں

۔۔۔ یہ کچے گھر نوٹوں سے بھری تجوریوں سے دس مالہ مال میں بدلے جا سکتے ہیں ۔آج ڈائیلاگ بازی نہیں چلتی ہے۔آدمی کا پریکٹیکل ہونا بہت ضروری ہے ۔ باہر آ جاؤ اپنے اس دقیانوسی سوچ سے ۔آج میرے قدم کے ساتھ قدم ملاؤ اور دنیا فتح کرلو۔ یہ دنیا اسی کی ہے جو اس کی شہہ رگ پر اپنا پیر رکھنا جانتا ہو۔اپنا پیر آگے بڑھاؤ اور فتح کرلو ساری دنیا کو۔ دینا طاقتوروں کی ہے ۔کمزوروں کو یہ دنیا کیڑے مکوڑے کی طرح کچلتی ہے ۔۔۔نکل آؤ اپنی اس کیڑے مکوڑوں والی دنیا سے ۔اور میری دنیا میں شان سے رہو اور عیش کی زندگی گزارو۔۔۔‘‘

روحی اور بھی بہت کچھ بولتی جا رہی تھی ۔لیکن یہ سب باتیں میرے لئے بالکل غیر مانوس تھیں ۔ میرے کانوں میں آج تک ایسی باتوں کی بھنک بھی نہیں پڑی تھی ۔۔۔ میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ رہا تھا۔

روحی ضدی تھی اور اس کی ضد کے سامنے کسی کی کچھ بھی نہیں چلتی تھی۔ اس کا چالاک اور شاطر باپ بھی اس کی ضد کے سامنے ہار گیا۔اس کے سارے رشتہ دار انگشت بدنداں رہ گئے ۔۔۔اس کی ضد تھی بھی ایسی جو کسی کو بھی قبول نہیں تھی ۔اس نے مجھے اپنا شریک حیات چن لیا تھا۔اس کے رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ میرے پاس پڑوس والے بھی حیران ہوکر رہ گئے تھے۔میری ماں کی عزت کرنے والے اور میرے ساتھ محبت کرنے والے لوگ بہت خوش تھے ۔وہ سمجھ رہے تھے کہ میری ماں کا صبر اور اس کی دعائیں رنگ لائیں ۔جو ہم اس غربت کی دلدل سے باہر آئے اور اب انسانوں کی طرح خوشحال زندگی گزاریں گے۔۔۔ اب ہماری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔

اونچے محلوں کی روحی کا ہمارے چھپر میں دلہن بن کر آنا کسی کرشمے سے کم نہ تھا۔ ہمارے چھوٹے سے گھر میں ہفتوں پڑوسیوں کی بھیڑ لگی رہی ۔خاص کر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا جمگھٹا تو دن بھر لگا رہتا تھا۔ وہاں ان کے لئے نیل پالش کے ڈھیر لگے تھے ۔چھوٹے چھوٹے

خوشبودار صابن، بالوں کے رنگ برنگے فیتے اور ربن، پرفیوم اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں ۔۔۔مسکراہٹ جیسے میری ماں کے چہرے پر ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔وہ ہنستے مسکراتے مہمانوں کو زعفران کا قہوا پلاتی رہتی تھی۔اور دن میں سو بار روحی کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھی۔۔۔

لیکن غریبوں کے گھر میں خوشیاں زیادہ دیر کہاں ٹک پاتی ہیں۔ان کا اصل ٹھکانہ چھپر کہاں بن پاتا ہے۔ ویسے بھی غریب کے گھر میں روزن ہی روزن ہوتے ہیں۔ باہر جانے کے ہزار راستے۔۔۔لیکن روحی سر اٹھا کے، بڑے تکبر کے ساتھ اپنا سارا سامان سمیٹ کر دروازے سے نکل گئی تھی۔ میری ماں کی چادر روندھ کر جو اس نے روحی کو روکنے کے لئے پاؤں کے نیچے ڈال دی تھی۔ میں نے بڑی بے بسی کے ساتھ روحی کی طرف دیکھا اور بڑے دکھ کے ساتھ ماں کے سر کی چادر اٹھائی۔ پہلے آنکھوں سے لگائی پھر دونوں ہاتھوں سے کس کر سینے سے لگا دی۔

روحی کو میری بہت فکر لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے لیکن اس کے لئے یہ گھر اور یہ ماحول ٹھیک نہیں تھا۔ اگر مجھے اپنے سپنے پورے کرنے ہیں تو اس کے لئے مجھے یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔روحی کے باپ کے گھر میں وہ بڑی سی خواب گاہ میری منتظر تھی۔جس میں بیٹھ کر یا سو کر میں وہ بڑے بڑے خواب دیکھ سکتا تھا۔ جو بڑے لوگ ایسی خوابگاہوں میں دیکھتے رہتے ہیں۔اور میرے سپنوں کو ساکار کرنے یا پورا کرنے کے لئے روحی کے باپ کی تجوریاں بےقرار تھیں۔۔۔ جانے یہ عقل کا اندھیرا پن ہے یا ہم غریب لوگوں کی جبلت ہے ہم بیوی کی اچھی اور بڑی بات کا مطلب بہت چھوٹا نکالتے ہیں اور میں نے بھی اپنی غریب ماں کے ساتھ مل کر روحی کی بڑی بات کا چھوٹا سا معنٰی نکالا۔ وہ یہ کہ روحی چاہتی ہے کہ میں اس کے باپ کا گھر داماد بن جاؤں۔۔۔یعنی میں گھر جمائی۔۔۔بات تب دل کو زیادہ لگی جب میں نے ماں کا ذکر کیا تو روحی ایک دم چیخ اٹھی۔

''کیاتم ابھی بھی ماں کی چھاتیوں سے چمٹے بیٹھے ہو۔۔۔تم نے ایک ہی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرنا ہے۔۔۔میں یا تیری ماں۔''

اور مجھ نالائق نے ماں کو چن لیا۔۔۔پھر روحی کا میرے گھر میں رکنے کا کیا جواز بنتا تھا اور وہ بڑی اکڑ کے ساتھ میری غریبی کو ٹھوکر مار کر چلی گئی۔۔۔پھر اس کی ضد بہت زیادہ بڑھ گئی اور اب کی بار اس کی ضد کے ساتھ اس کے ماں باپ کی ضد بھی شامل تھی۔اور ان کا شکار میں، ایک غریب ماں کا اکلوتا سہارا۔۔۔۔لیکن ان سب کی ضد نے مل ملا کر مجھے بھی بہت ضدی بنا ڈالا تھا۔ پہلے انہوں نے کئی طریقوں سے مجھ پر دباؤ ڈالا۔پھر مجھے ڈرایا دھمکایا ۔لیکن جب ان کی کچھ نہ چلی تو انہوں نے سیدھے مجھ سے طلاق کی مانگ کر لی۔میں روحی سے ملنا چاہتا تھا۔اسے محبت کے دن یاد دلانا چاہتا تھا۔ یونیورسٹی میں گزارے وہ پیار و محبت کے لمحات ۔پہلگام کی سرمئی شامیں آنکھوں میں اتارنے کے حسین پل ۔گلمرگ کی حسین صبحیں ،سورج کی سنہری کرنوں سے مخملی گاس پر شبنمی قطروں کی رنگینوں میں کھو جانا۔سون مرگ،نشاط،شالیمار، چشمہ شاہی اور پری محل باغات کی سیر۔جھیل ڈل کے نرم سینے پر مچلتی تیرتی شکارے سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوس ہوٹ کے ٹیرس تک آنا۔پھر گھنٹوں پیار محبت کی باتیں ۔وہ سب اسے یاد دلانا چاہتا تھا۔لیکن روحی کی ضد ہمارے آڑے آرہی تھی۔وہ شادی سے پہلے جتنا مجھ سے پیار کرتی تھی اب اسے ہزار گنا مجھ سے نفرت کرتی تھی۔جب وہ مجھے آنکھوں سے دور رکھنے کی سوچ بھی نہیں سکتی تھی اب ان ہی آنکھوں میں میرے لئے حقارت کے سائے تیر رہے تھے۔وہ مجھ سے ملنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ جب بھی کہیں چلی جاتی تھی تو کئی لوگوں کے ساتھ جاتی تھی۔۔۔

طلاق مانگ کر وہ میری مردانگی کو چلینج کر رہے تھے اور یہ میں کسی بھی حالت میں نہیں مان سکتا تھا۔لیکن تب مجھے اس کے باپ کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ یا شاید یہ اس کے

باپ کی نہیں بلکہ پیسے کی طاقت تھی ۔ پیسے کی طاقت سب پر حاوی تھی ۔انہوں نے میرے خلاف ہر شرعی کوٹ سے رجوع کیا اور مجھے بیوی کے لئے نا اہل ثابت کرنے کے ڈھیروں فتوے لائے ۔ پھر پولیس ، روز کسی نہ کسی تھانے سے مجھے بلاوا آنے لگا تھا ۔ پھر کورٹ کچہری۔ جہاں میں کسی بڑے وکیل کی خدمات بھی لے نہیں سکتا تھا۔ یہاں سب جگہ پیسہ بولتا تھا۔میرا وکیل بھی کمزور تھا اور میرے مددگار بھی مسکین ۔۔۔لیکن میں پھر بھی ڈٹا رہا۔۔۔ ڈٹا رہنا میری مجبوری تھی ۔میری ماں کی خاطر۔میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں کو لگے کہ میرا بیٹا اتنا کمزور ہے کہ پہلی ہی پیشی پر ٹوٹ گیا۔۔۔اصل میں تو یہ جنگ میں بہت پہلے ہار چکا تھا لیکن پتا نہیں میرے حریف یہ کیسے سمجھ رہے تھے کہ میں جیت رہا ہوں ۔اب روحی کو طلاق دینے کے لئے میرے پاس کئی آفر آ رہے تھے۔ مجھے پیسے سے خریدا جا رہا تھا لیکن میں اپنی ضد پہ اڑا رہا۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے لیکن میں روحی کو چھوڑوں گا نہیں۔ لیکن یہ سب کہنے کی باتیں تھیں ۔کچھ بھی ہوجائے کہنا آسان ہے لیکن جب بیچ میں جان پر بن آتی ہے تو معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے ۔۔۔کورٹ کچہری اور تھانوں میں گھسیٹنے تک میں ڈٹا رہا ۔لیکن اب بات دوسری تھی ۔انہوں نے کرائے کے غنڈے خرید لئے ۔اب وہ میری جان ہی لینا چاہتے تھے ۔میری جان جاتی تو روحی خود بخود آزاد ہوجاتی ۔ وہ نہیں کہتے جان ہے تو جہان ہے ۔۔۔ایک بار مجھ پر جان لیوا حملہ بھی ہوا پر میں بچ گیا۔لیکن ایسا بار بار ہوجائے یہ ضروری نہیں تھا۔ جب یہ بات میری ماں تک پہنچی تو اس کی راتوں کی نینداور دن کا چین اڑ گئے ۔۔۔ڈر تو میں بھی بہت گیا تھا۔لیکن ماں کی طرف دیکھتا تو ضبط کرلیتا تھا۔ پر اب سیلاب سر تک آ گیا تھا۔اب تو میں بھی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا کہ معاملہ تھوڑا سا بات چیت پر آ جائے اور میں روحی کو طلاق دے دوں ۔تا کہ لوگوں میں میری سبکی نہ ہوجائے ۔لیکن ایسا کوئی ثالث بھی نہیں تھا جو میری طرف سے ان کے پاس جاتا اور

معاملہ رفع دفع کر کے آجاتا۔۔۔میں اب خاموشی کے ساتھ روحی کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔لیکن اب مجھے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔

خوف اور ڈر کا ماحول میرے اردگرد اپنا حصار تنگ کرتا جا رہا تھا۔خاموشی بھی اتنی جتنی ایک بڑی سونامی آنے سے پہلے سمندر میں ہوتی ہے۔اب تو مجھے یقین ہو رہا تھا کہ اب یا جب مجھے مار دیا جائے گا اور یہ ساری لڑائی ختم ہو جائے گی۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں ایک دم آزاد ہو گیا۔وہ دن میرے لئے ڈھیر ساری خوشیاں ایک ساتھ لے کر آیا تھا۔یہ ساری خوشیاں میں اپنی ماں کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا۔۔۔ مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر۔مجھ سے پوچھے بغیر۔مجھے کسی خاطر میں لائے بغیر روحی اپنے باپ کے ایک نوکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔مجھے نہیں معلوم روحی کے اس کانڈ میں اس کا بے غیرت باپ شامل تھا کہ نہیں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بہت خوش ہوگا۔کیونکہ اسے برسوں سے اپنے ہی جیسے ایک بے ضمیر گھر داماد کی تلاش تھی۔۔۔

لیکن جانے کیوں مجھے اپنے جان پہچان والوں کی آنکھوں میں یہ ایک لفظ تیرتا اور اچھلتا ہوا نظر آ رہا تھا ''بے غیرت''

☆☆☆

پلکوں میں چھپے خواب

سنڈے مارکیٹ۔۔۔نام سنتے ہی ڈر اور خوف کی لہر جیسے میرے بدن میں دوڑ گئی۔ یہاں کے حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ بھیڑ بھاڑ والے بازاروں میں جانے سے خوف آتا تھا۔ پتا نہیں کب کیا حادثہ پیش آجائے۔ گولیاں چلنے اور کہیں بھی بم پھٹنے کے واقعات عام ہورہے تھے۔

لیکن میرا جانا ضروری تھا۔ یہ میرے بابا کا حکم تھا۔ بابا بیس بائیس سال پہلے حج سے ایک ریڈیوسیٹ لائے تھے۔ جو چند مہینے پہلے خراب ہوگیا تھا۔ بابا کے حکم سے میں نے کئی مکینکس کو دکھایا لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ سب نے یہی بتایا کہ اس کی کوئی آئی سی خراب ہوچکی ہے جو یہاں نہیں مل سکتی۔ اب یہ ریڈیو کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ ٹی وی پر لائیو نیوز چینلز کی بھرمار تھی۔ بابا سے نیا ریڈیوسیٹ لا کے دینے کی بھی بات کہی۔ لیکن بابا کو کون سمجھائے۔ وہ اسی کو ٹھیک کروانے پر بضد تھے۔ پھر کسی نے ان سے کہہ دیا کہ ایسے ریڈیوسیٹ سنڈے مارکیٹ میں ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ بابا لگاتار چھ دن تک یاددہانی کراتے رہے کہ اگلی اتوار کو سنڈے مارکیٹ جانا ہے اور وہاں سے ریڈیوسیٹ ٹھیک کرا کے لانا ہے۔ اتوار آگیا اور بابا میرے سر پر کھڑے ہوگئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اتوار کو دیر تک میرے سونے کی آرزو آرزو بن کر ہی رہ گئی۔ معمولی ناشتہ کر کے میں ریڈیوسیٹ لے کر سنڈے مارکیٹ کی طرف نکل گیا۔ نزدیکی پارکنگ میں گاڑی لگا کر میں بازار میں آگیا۔ ایسے بازاروں میں جانے کا ڈر اپنی جگہ لیکن یہاں آکر مجھے مزہ آگیا۔ بھیڑ سے بھرا بازار۔۔۔سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ بھی بند۔ ریڑھی والوں اور فٹ پاتھ پر سامان بیچنے والوں کا شور۔ آتے جاتے لوگوں کی بڑھتی تعداد جن میں

زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ بازار ایک دم کلر فل لگ رہا تھا۔ مجھے سب کے چہرے خوش اور مسکراتے نظر آ رہے تھے۔لیکن ایک بات پر میں حیران تھا کہ سنڈے مارکیٹ میں ایسے کم ہی لوگ تھے جو پرانا سستا یا ٹوٹا پھوٹا سامان بیچتے تھے۔ یہاں زیادہ تر نئے ساز و سامان سے آراستہ ریڑھیاں اور فٹ پاتھ بھرے تھے۔ میرے مطلب کے کئی چھوٹے موٹے مکینک بھی تھے۔سب کو بابا کا ریڈیو سیٹ دکھایا لیکن کسی ایک کے پاس بھی اس کا علاج نہیں تھا۔ کچھ لوگ تو ریڈیو سیٹ دیکھ کے ہنس بھی دیئے تھے۔ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

''صاحب جی! یہ کیا سن سنتالیس کی چیز لئے گھومتے پھر رہے ہیں آپ۔ کباڑیا تو پانچ روپے بھی نہیں دے گا اس کے۔'' مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اپنے غصے پر قابو پا کے بڑی نرمی سے بولا۔

''تم اسے ٹھیک کر کے دے دو۔ میں تمہیں پانچ سو روپے دے دوں گا۔'' اس نے پھر سے ریڈیو سیٹ کھولا۔ اسے غور سے دیکھا۔آخر سر ہلا کر بولا۔

''نہیں صاحب جی۔ میرے بس کا نہیں ہے یہ۔۔۔'' اس نے ریڈیو سیٹ بند کر کے واپس کر دیا۔ میں بڑی ناامیدی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ میں نے دیکھا، فٹ پاتھ کے بڑے حصے پر قالین والوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ میں قریب گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک قالین جو میں نے کچھ ہفتے پہلے شہر کے ایک بڑے شوروم میں دیکھا تھا۔ ویسا ہی قالین یہاں فٹ پاتھ پر بھی پڑا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہر اصل چیز کی نقل ہمارے شہر میں بھی ملتی ہے۔ پھر بھی میں اسے قریب سے دیکھنے گیا۔''ہاں صاحب جی بولیے۔کیا پسند آیا آپ کو۔''

''یہ قالین اصلی ہے۔۔۔یا۔۔۔''

''اصلی ہے جناب۔۔۔ہم نقلی مال نہیں بیچتے ہیں۔ ویسے بھی اتنے مہنگے قالین کی

نقل نہیں بنی ہے ابھی تک''

''آپ کے پاس تو ایک ہی پیس ہے یہ۔ مجھے تو جوڑا چاہئے تھا۔''

''وہ فکر نا کریں آپ صاحب جی۔ اس ڈیزائن میں آپ کو جتنے پیس چاہئیں، مل جائیں گے۔ آپ چاہیں تو پورے گھر کو ڈیکوریٹ کر سکتے ہیں۔۔۔ اتنے پیس موجود ہیں ہمارے پاس۔۔۔''

''کتنے کا جوڑا ملے گا۔'' اور اس نے جو قیمت بتائی وہ شوروم کی قیمت سے آدھی تھی۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ نقلی ہی ہے۔

''لیکن یہاں تو آپ کے پاس ایک ہی پیس ہے۔ دوسرا پیس کہاں سے دیں گے۔''

''صاحب جی یہ لیجئے ہمارے شوروم کا کارڈ۔ آپ کو یہاں صرف آرڈر بک کرنا ہے۔ مال تو آپ کو شوروم سے ہی ملے گا۔ آپ کا آرڈر تو ہم آپ کے گھر بھیج دیں گے۔ ہمارا سسٹم ہے ہوم ڈیلیوری کا۔'' سیلز مین کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن میں کارڈ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ اسی شوروم کا کارڈ تھا جہاں سے یہی قالین مجھے ڈبل قیمت پر مل رہا تھا۔

''لیکن شوروم پر تو آپ یہ قالین مہنگا بیچتے ہیں۔''

''صاحب جی شوروم کی بات الگ ہے اور یہاں کی بات الگ۔ اگر آپ اس قالین کی بکنگ یہاں سنڈے مارکیٹ سے کریں گے تو آپ کو یہی قیمت دینی پڑے گی۔ چاہے آپ کو مال کی ڈیلیوری کہیں سے بھی ملے۔'' میں نے ان کو کچھ رقم ایڈوانس دی اور مجھے تب ایک اور جھٹکا لگا جب انہوں نے مجھے پیسوں کی رسید بھی اسی شوروم کی تھما دی۔ تو یہ ثابت ہو گیا تھا کہ یہ غریبوں کی مارکیٹ بس نام کی تھی اور قبضہ یہاں پر بھی بڑے بڑے مگرمچھوں کا ہی تھا۔

میں چلتے چلتے دوسری سڑک پر آ گیا تو یہاں مجھے اصلی سنڈے مارکیٹ نظر آ گئی۔ پرانی چیزیں۔ پرانے کپڑے۔ پرانا ساز وسامان۔ اور لوگوں کی بھیڑ جو یاس کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ یہاں پر مجھے اپنا مطلوبہ مکینک بھی مل گیا۔ یہ ایک چھوٹا لڑکا تھا۔ اس کے کپڑے بوسیدہ ضرور تھے لیکن اس کا چہرہ خوبصورت تھا، آنکھیں روشن تھیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ، بال ریشمی اور گیلے تھے۔ جیسے ابھی ابھی نہا کر آیا ہو۔ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی اسٹول نما کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے بھی ایک ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سی میز تھی، جس پر ریڈیو ٹھیک کرنے کا سامان اور کچھ پرانے ریڈیو سیٹس کے پرزے بکھرے پڑے تھے۔ میز کے نیچے بھی چند ٹوٹے ریڈیو سیٹ تھے۔ کچھ اور سامان بھی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں بیٹری سے چلتا ایک چھوٹا سا پاور انورٹر بھی تھا۔ یعنی میرا مطلوبہ آدمی یہاں پورے ساز وسامان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''یہ ریڈیو سیٹ ٹھیک ہوگا'' میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''کیوں نہیں ہوگا صاحب۔۔۔ راجو مستری ماسٹر ہے صاحب۔ ایسے ریڈیو سیٹ بائیں ہاتھ سے ٹھیک کرتا ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ سے ریڈیو سیٹ لے کر کہا اور اسے کھولنا شروع کیا۔

''یہ۔۔ یہ راجو مستری کون ہے۔'' میں نے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ مجھے لگا اس کا مالک کوئی اور ہے۔ جس کا نام راجو ہے۔

''میں ہوں نا صاحب۔ راجو میرا نام ہے۔'' راجو کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی اور ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھوں میں وہ سارے خواب نظر آ رہے تھے، جن میں کچھ کرنے کی لگن اور اپنی غربت سے نکل آنے کی جستجو تھی۔

راجو ریڈیو سیٹ کے پرزے الگ الگ کر رہا تھا تو مجھے لگا اس کو ابھی وقت لگے گا۔ میں بھی سنڈے مارکیٹ گھومتے گھومتے تھک چکا تھا۔ اور چائے کی بھی سخت طلب ہو رہی تھی۔

راجو کو کہہ کر میں پاس ہی ایک ریسٹورینٹ کے اندر چلا گیا۔ یہاں کافی رش تھا۔ ایک بیرے نے رہنمائی کی اور میں دوسری منزل پر آ گیا۔ یہاں بھی اچھی خاصی بھیڑ تھی لیکن مجھے کھڑکی کے پاس ایک کرسی مل ہی گئی۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی ستانے کیلئے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر لیں۔ بیرا آ گیا میں نے اسے چائے اور کھانے کے لئے کچھ ہلکا پھلکا لانے کا آرڈر دے دیا۔ چائے آ گئی۔ اچھی چائے تھی۔ میں مزے سے چسکیاں لے کر کھڑکی سے باہر سنڈے مارکیٹ کا نظارہ کرنے لگا۔

یہاں سے سنڈے مارکیٹ کا بڑا حصہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں راجو کو دیکھ رہا تھا۔ جو میرے ریڈیو سیٹ میں لگا تھا۔ اس کے پاس ایک دو لوگ اور بھی آ چکے تھے۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید وہ بھی جواب دے رہا تھا لیکن اس کی نظریں ریڈیو سیٹ پر ہی جمی تھیں۔ راجو کے قریب ہی ایک ریڑھی والا پرانے استعمال شدہ زنانہ کپڑے بیچ رہا تھا۔ پھر ایک اور آدمی بیٹھا تھا وہ پرانے جوتے بیچ رہا تھا۔ اس سے آگے دو لوگ اور بیٹھے تھے جن کے سامنے سستے مال کا اسٹال لگا تھا۔ اور ان کے آگے کئی ریڑھی والے پرانا اور سستا سامان بیچ رہے تھے۔ راجو کے ساتھ لگا ریڑھی والا جو پرانے زنانہ کپڑے بیچ رہا تھا۔ اس کے گرد عورتوں اور لڑکیوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ جو کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ شاید کوئی کچھ خرید بھی رہی تھی۔ اب میری نظریں ریڑھی والے کی طرف ہو گئی تھیں۔ وجہ تھی وہ دو بچیاں جو بہت ہی معصوم اور خوبصورت تھیں۔ ان دو میں جو چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔ وہ دونوں بار بار ایک رنگین فراک شلوار ہاتھ میں اٹھاتی تھیں۔ اس کو الٹ پلٹ کرتیں۔ اوپر نیچے دیکھ کر واپس رکھ دیتی تھیں۔ پھر کچھ اور کپڑوں کو دیکھ کر ان کی نگاہیں واپس اسی جوڑے پر اٹک جاتی تھیں۔ مجھے لگا فراک شلوار تو ان کو پسند آیا ہے۔ لیکن یا تو ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ یہ خرید سکیں یا کپڑے میں کوئی نقص ہے۔ بڑی

لڑکی نے آہستہ سے کچھ کہا تو چھوٹی لڑکی کی مسکراتی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔۔۔میں ابھی کچھ طے بھی نہیں کر پایا تھا کہ اچانک زوردار دھما کہ ہوا۔میں نے بس اتنا دیکھا ہوا میں دھول کے ساتھ ساتھ انسانی اعضاء بھی تیر رہے تھے۔ان میں وہ خوبصورت اور معصوم چہرے بھی تھے جن کی کھلی آنکھوں میں ایک پرانی فراک شلوار نہ خرید پانے کی وجہ سے تشویش کے سائے لہرا اٹھے تھے۔ ایک چہرہ راجو کا بھی تھا جس کی آنکھوں میں وہ سارے خواب سمٹ کر یاس اور ناامیدی میں ڈھل چکے تھے۔جن کو وہ اپنی ذہانت اور عزم سے پورا کرنا چاہتا تھا۔زمین پر آتے آتے وہ اداس آنکھیں بند ہو چکی تھیں کہ کھلی رہ گئی تھیں، مجھے نہیں معلوم۔۔۔

☆☆☆

خوابِ گراں

پروین کے دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ ہر صبح گاؤں کے چشمے کے کنارے بیٹھ جاتی۔ جس میں دور دور تک کنول کے پھول کھلتے تھے۔ وہ چشمے کے شفاف پانی میں ماجد کا عکس تلاشتی رہتی جو بچپن میں اکثر اس کے ساتھ یہاں آ کر پانی میں اپنا ہلتا ڈلتا عکس دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں کنول کے پھول لے کر پانی پر مارتا تھا۔ ہاتھوں سے پانی کو ہلا جلا کر اپنا عکس پانی پر بکھرا دیتا تھا اور خوش ہو کر چلاتا رہتا تھا۔ پروین اسے خوش دیکھ کر اور زیادہ خوش ہو جاتی تھی۔۔۔ وہ خیالوں میں ذہن کے اسکرین پر ماجد کا عکس ابھار لاتی۔ پھر وہی عکس دیر تک چشمے کے پانی میں تلاشتی رہتی لیکن ماجد کے ننھے ہاتھ اس کے تخیل میں بسا چہرا ٹھہرنے نہیں دیتے۔ جونہی شکل بننے لگتی اسی وقت وہ بکھر کر پانی میں گڈمڈ ہو جاتی۔ وہ ٹکر ٹکر پانی پر دیکھتی رہتی۔ لیکن یہاں اسے ماجد کے بدلے اپنی ہی صورت نظر آتی۔ وہ غصے میں ماجد کی طرح دونوں ہاتھ پانی کی سطح پر مارتی۔ اس کی صورت ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ انگلیوں سے پانی کو زور زور سے ہلاتی تو شکل پانی کی لہروں میں تحلیل ہو کر گم ہو جاتی۔ وہ پانی سے ایک ہی جگہ رکا رہنے کی التجا کرتی۔ چشمے کے کنارے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی۔ پانی سے اپنے بیٹے کا عکس مانگتی۔ یہ عمل وہ ہزار بار دہراتی۔

ماجد اسے چھوڑ کر جا چکا تھا اور وہ اس کے آس پاس ہی اس کے ساتھ چھپا چھپی کا کھیل کھیل رہا تھا۔۔۔ وہ ہفتہ دس دن میں اس کے ساتھ دیر تک باتیں بھی کرتا تھا لیکن پروین جانتی تھی کہ وہ اس کے قریب ہو کر بھی اسے بہت دور جا چکا ہے جہاں سے اس کا لوٹ آنا اب مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ ماجد اب پندرہ سال کا ہو چکا تھا اور یہ پندرہ سال پرو

ین دنیاو مافیہا سے بے نیاز صرف ماجد کی پرورش میں کھوئی رہی۔اس نے ان پندرہ برسوں میں ماجد کوایک پل بھی اپنے سے دور نہیں کیا ۔۔۔

تب پروین صرف انیس سال اور کچھ مہینے کی ہی تھی جب اس کی شادی غلام نبی کے ساتھ ہوگئی تھی ۔اس رشتے کے لئے دادی نے زور لگایا تھا۔غلام نبی اس کی بڑی بیٹی کا لڑکا تھااور پروین منجھلے بیٹے کی بیٹی ۔غلام نبی پچیس سال کا خوبصورت گبرو جوان تھا۔گریجویشن کا امتحان پاس کرتے ہی اسے سرکاری نوکری بھی مل گئی تھی ۔دادی جلد سے جلد پروین کی شادی اس کے ساتھ کرادینا چاہتی تھی ۔۔۔حالات دن بہ دن مخدوش ہوتے جارہے تھے اورسب ڈرے ڈرے سہمے سہمے سے رہنے لگے تھے۔ خاص طور سے وہ لوگ جن کے گھروں میں جوان بیٹیاں تھیں۔ بڑے بوڑھے اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی بھی طرح گھر کی جواں بیٹی جلد سے جلد بیاہی جائے اوران کے سر سے یہ بھاری بوجھ اتر جائے تو اچھا۔شادی کے بعد غلام نبی اور پروین کا ساتھ صرف گیارہ مہینے کا رہا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک دن سارا گاؤں فوج نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔گھر گھر تلاشیاں ہورہی تھی ۔گھر کی چیزوں کے ساتھ الٹ پھیر کیا جارہا تھا۔ایک ٹکڑی غلام نبی کے گھر کی بھی تلاشی لینے لگی ۔اس کی کتابوں سے کچھ ایسے کاغذات بھی برآمد ہوئے جو پولیس کی نظر میں مشتبیہ تھے۔غلام نبی گھبرا گیا۔اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور کھڑکی سے چھلانگ لگادی ۔فوجیوں نے شورشرابے کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلائیں اور غلام نبی کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ وہ موقعے پر ہی دم توڑ بیٹھا۔گھر والوں نے ہنگامہ کیا تو ان کو بھی مارا پیٹا گیا۔ مار پیٹ کے بعد انہیں ایک طرف کھڑا رکھا گیا۔غلام نبی کی لاش سارا دن بے گور وکفن آنگن میں پڑی رہی۔شام کواس کی لاش پولیس لے گئی اوررات دیر گئے پوسٹ مارٹم ہونے کے بعداس کی میت گھر والوں کو واپس مل گئی۔ پھر صبح تک بات آس پاس کے گاؤں تک پھیل گئی اورسب جگہوں سے ہزاروں لوگ

یہاں پہنچ گئے ۔غلام بنی کی میت کوایک چارپائی پہ رکھ کر سارے علاقے میں اس کا جلوس نکالا گیااور آزادی کے حق میں نعرے بلند ہوتے رہے۔ پھر بڑی شان کے ساتھ غلام نبی کی میت کو دفنادیا گیا۔

غلام نبی کی موت سے پروین پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔اس کے لب جیسے سل کر رہ گئے ۔وہ آنے والوں کو بس ایک ٹک دیکھتی رہتی تھی ۔جس سے گھر والوں کو کافی تشویش ہوگئی ۔ انہوں نے پروین کو کئی ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھایا۔سب نے ایک ہی بات کہہ دی تھی کہ یہ کسی بھی طرح سے روئے ،نہیں تو اس کا دماغی توازن بگڑ بھی سکتا ہے۔ پھراس نے غلام نبی کے مرنے کے تین مہینے بعد تب زاروقطار رولیااور چیخ چیخ کر دُہائی دی جب اس نے ماجد کو جنم دیا۔اس دن وہ اکیلی نہیں روئی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے سارے گھر والے بھی رو دیئے تھے۔۔۔غلام نبی کے مرنے اور ماجد کے پیدا ہونے کے بعد اس کا باپ عبدالرحمان اسے اپنے گھر لایا تھا۔اس دن بھی یہاں صف ماتم بچھ گئی تھی ۔اسے دیکھتے ہی اس کی ماں ، دادی بھائی بہن سب بہت روئے تھے ۔اڑوس پڑوس تو ساراامڈ آیا تھااور ہر ایک آنکھ نم تھی ۔ دادی تو اس کے بعد کبھی مسکرائی بھی نہیں تھی ۔ ماجد کے پیدا ہونے کے دو سال بعد ہی دادی نے بہت کوشش کی تھی کہ جوان بچی کی پھر سے شادی ہوجائے ۔وہ کب تک اپنی جوانی کا بوجھ لئے پھرتی رہے گی ۔لیکن پروین کے انکار کے سامنے کسی کی بھی ایک نہ چلی۔اور پروین ، وہ جیسے اپنے بیٹے ماجد کے پیار میں خود کو فراموش کر چکی تھی ۔وہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں رہتی تھی ۔اس نے ماجد کا ایڈمشن پاس والے اسکول میں کرالیا۔صبح اسے اسکول تک چھوڑنے جاتی اور چار بجنے سے پہلے ہی اسکول کے باہر کھڑی ہوجاتی ۔اس کا بس چلتا تو وہ بھی سارادن ماجد کے ساتھ ہی اسکول میں گذار دیتی ۔۔۔۔ یہاں تک کہ گاؤں کے بڑے چشمے تک بھی ماجد کے بغیر نہیں جاتی تھی ۔وہ دونوں ماں بیٹا اکثر یہاں بیٹھتے تھے۔ماجد چشمے سے نکلنے والی

بڑی اور کھلی ندی میں کنول کے پھولوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا اور پروین یوں تو ماجد کو دیکھتی رہتی تھی لیکن وہ خیالوں میں غلام نبی کے ساتھ یہاں چشمے کے کنارے بیٹھی اس کے مسکراتے چہرے کو تکتی رہتی تھی۔ اس کے پاس غلام نبی کی یادوں اور قربتوں کا بہت ہی قلیل سرمایہ تھا لیکن اسنے اسی کو اپنی ساری زندگی کا اوڑ نا بچھونا بنالیا تھا۔

ماجد ابھی ابھی ہائیر سکنڈری میں آیا تھا۔ یہاں روز کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہوتی ہی رہتی تھی اور لڑکے اسکول سے باہر آ کر سکورٹی فورسز پر پتھراؤ شروع کر دیتے تھے۔ ماجد سب سے آگے رہتا تھا۔ سارے لڑکے ماجد کو اپنا لیڈر ماننے لگے تھے۔ ایک تو لڑکے میں جرات بہت تھی اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ اسے باپ کی شہادت کی وجہ سے سبھی لڑکے اور استاتذہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بہت جلد ماجد کا نام پولیس کی ڈائیری میں آ گیا تھا اور آئے دن اس کے گھر چھاپے پڑھنے لگے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچتا رہا مگر اس کے بدلے دو تین بار اس کے ماما محمد عارف کو مار پڑی اور ایک بار اسے گرفتار کر کے بھی لے گئے۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی تھی جب ایک چھاپے کے دوران اس کی ماں کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا۔ اس کے نانا عبدالرحمان نے مداخلت کی تو اسے زدوکوب کیا گیا اور دو دن تھانے میں بند رکھا گیا۔ پھر اسے مچلکے پر چھوڑ دیا گیا جس میں اسے اقرار لیا گیا تھا کہ وہ ماجد کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ بس یہ سب سنتے ہی ماجد کا گھر سے بھاگنا ناگزیر بن گیا تھا۔ وہ کسی جنگجو تنظیم میں شامل ہو گیا۔ اور اسی شام اس کی فوٹو سوشل میڈیا پر بھی آ گئی تھی ---

یہ چلہ کلان کا پندرہ واں دن اور جنوری کی چار تاریخ تھی --- باہر کڑاکے کی ٹھنڈ تھی۔ اس لئے گھر کے سبھی لوگ کچن کے ساتھ جڑے حمام والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ جو بہت گرم تھا۔ پروین کا چھوٹا بھائی عارف جلدی جلدی کمرے میں گھس آیا---

''آپا --- آپا ماجد کا فون ---'' سبھی لوگ خاموشی سے عارف کو دیکھنے لگے۔

پھر پروین کو، جس نے جلدی سے عارف کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ اب سبھی پروین کو دیکھ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر تجسس تھا، تو کسی کے چہرے پر ڈر اور کسی کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔۔۔

''ہاں میرے بیٹے۔ میرے لعل۔'' پروین کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ عارف نے موبائیل فون کو لوڑ اسپیکر پر رکھا ہوا تھا۔ فون سے ماجد کی آواز صاف اور اونچی سنائی دے رہی تھی۔ سبھی لوگ سانس روکے ماجد کو سن رہے تھے۔۔۔

''ماں رونا نہیں۔۔۔'' پروین کے چہرے پر جیسے مردنی چھا گئی۔ باقی لوگ بھی پریشان ہو گئے تھے

''ماں اپنا خیال رکھنا۔۔۔ ماں مجھے واقعی بہت دکھ ہے۔ میں آپ کا زیادہ ساتھ نہ دے سکا۔ ماں میں اپنے ابو کے پاس جا رہا ہوں ۔ ماں میں ابو کو تیری ساری باتیں، تیرے سارے دکھ، سارے درد بتا دوں گا۔۔۔ ماں میں اسے بتا دوں گا۔ میری ماں آپ کو بہت مس کرتی ہے۔۔۔ ماں، میں اسے بتا دوں گا میری ماں آج بھی روز چشمے پر جاتی ہے اور وہاں گھنٹوں تیری یاد میں آنسوں بہاتی رہتی ہے۔ میری ماں آپ کو قریب سے محسوس کرنے کے لئے مجھے اپنے قریب رکھنا چاہتی ہے۔ وہ مجھ میں آپ کا عکس تلاشتی رہتی ہے۔ میری ماں۔۔۔ میں اسے بتا دوں گا میری ماں میرے بغیر نہیں جی پائے گی۔ میری ماں نے سارے جہاں سے آپ کے بعد مجھے چن لیا ہے۔ لیکن میں آپ کے چنے راستے کا شیدائی ہوں۔ میں نے آپ کا راستہ چن لیا ہے۔

کمرے میں سب رو رہے تھے کہ اچانک پروین کے باپ عبدالرحمان کا موبائیل فون بج اٹھا۔ سب کو خاموش کرانے کے لئے اس نے ہاتھ اٹھایا۔ اب سبھی لوگ عبدلرحمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔۔

'' آپ موبائیل فون سپیکر پر رکھئے ۔'' عبدالرحمان نے موبائیل سپیکر پر رکھ دیا تو آواز سارے کمرے میں گھونج اٹھی ۔

'' آپ کا پوتا ماجد فوجی محاصرے میں پھنس چکا ہے ۔انکونٹر شروع ہو گیا ہے ۔ ماجد سے بات کرو ۔اسے کہہ دو وہ پولیس کے سامنے سرنڈر کرے ۔تو اس کی جان بچ سکتی ہے ۔ ہمیں معلوم ہے وہ ابھی بہت چھوٹا ہے اور اپنی ماں کا اکلوتا سہارا بھی ۔جتنی جلدی ہو سکے ۔ اسے رابطہ کرو ۔''

باہر آنگن میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو رہی تھی ۔ اور وہ زور زور سے نعرے لگا رہے تھے ۔

''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے''

اندر صف ماتم بچھ چکی تھی ۔ گھر کی ساری عورتیں زار و قطار رو رہی تھیں ۔

دادی ، بوبہ ٹاٹھی ۔ آپ لوگ ابھی رومت ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ۔ میں اپنے عارف ماما سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔

''ہاں ہاں ۔۔۔ بولو ۔۔۔ بولو ماجد ۔۔۔۔ دادی ۔۔۔ ماں ۔آپ دومنٹ یہ رونا دھونا بند کر دو ۔ ہاں ماجد آپ بتاؤ ۔''

''عارف ماما میری ماں بہت دکھی ہے اور اب میرے بغیر بہت اکیلی بھی پڑ جائے گی ۔ اس کا خیال رکھنا ۔'' ساتھ ہی کمرے میں ایک ساتھ سب کی دھاڑیں مار کر رونے کی آواز گونج اٹھی ۔

'' آپ سب لوگ چپ ہو جاؤ ۔۔۔ یا دوسرے کمرے میں چلے جاؤ'' عارف سب کو چپ کرانے کے لئے چیخ پڑا تھا

ماجد ۔۔۔ ماجد ۔۔۔ میرے بیٹے واپس آ جاؤ ۔ ہم ماں بیٹا کہیں دور چلے جائیں

گے۔ان ظالموں سے دور جن کی وجہ سے یہاں ماں بیٹے ایک ساتھ نہیں رہ پاتے ہیں۔ ماجد میں تیرے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔نہیں جی پاؤں گی۔ ماجد تم خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔کم از کم میرے دل کو اتنا سکون تو رہے گا کہ میرا بیٹا زندہ ہے'' پروین زاروقطار رو رہی تھی۔

''نہیں پروین نہیں ۔۔۔اسے ایسا کرنے کے لئے مت کہو۔کچھ تو ہمارا ابھی سوچو۔'' عبدالرحمان بیٹی پر چیخ پڑا اور ساتھ ہی ہاتھ جوڑے اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھ بھی رہا تھا۔۔

اس دوران پولیس اور ماجد کے فون کٹ چکے تھے۔۔۔اور باہر آنگن میں جم کے نعرے بازی ہو رہی تھی۔

''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔''

☆☆☆

عید

جوں جوں کتے بھونکتے جا رہے تھے یوں یوں اس کے غصے کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔غصہ جو کبھی کبھی جھنجلاہٹ میں بدل جاتا تھا۔دانت کھٹ کھٹ بجنے سے ایک دوبار اپنی زبان بھی کاٹ لی تھی۔اگر چہ اس کی آواز میں کوئی درد کوئی سوز نہ تھا پھر بھی وہ مسجد کا موذن تھا۔جوں توں کر کے اذان تو دیتا تھا لیکن کتوں سے بہت پریشان تھا۔وہ اذان شروع کرتا تھا ،کتے بھونکنا شروع کرتے تھے۔اذان ختم ،کتوں کا بھوکنا بند۔۔۔اس نئی کالونی میں آئے ہوئے اسے چھ سال ہو چکے تھے۔یہاں آتے ہی مسجد فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ کیا دیا،ساری کالونی میں اس کا چرچا ہو گیا۔ملازمت سے سبکدوش ہونے تک کبھی کبھار صبح وشام اذان دیتا تھا اور رٹائر ہونے کے بعد مسجد کا سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور پانچوں وقت اذان بھی دینے لگا۔یوں تو وہ ساری کالونی میں اب عزت دار آدمی بن چکا تھا لیکن نہ جانے اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہاں سبھی اسے دکھاوے کی عزت کرتے ہیں۔دوسری طرف اذان کے وقت کتوں کی ہڑ بونگ اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھی۔وہ اکثر کتوں کے پیچھے دوڑتا تھا۔کئی بار میونسپلٹی سے رجوع کیا۔کتے گاڑیوں میں بھر بھر کر بند کروائے۔زہر دے کر مروائے۔اذان کے وقت لوڈ اسپیکر کی آواز بھی تیز رکھتا تھا مگر پھر بھی وقتِ اذان نہ جانے کتے کہاں سے آجاتے تھے اور عجیب عجیب آواز میں رونا شروع کر دیتے تھے۔کتوں کی آواز میں اس کی آواز دب جاتی تھی۔۔۔

وہ ایک چھوٹا سرکاری ملازم تھا لیکن ملازمت کے دوران بڑا پیسہ کمایا۔بہت زیادہ بددیانت اور رشوت خور آدمی تھا۔اس کا چہرا کرخت۔دل سیاہ اور دماغ شاطر تھا۔پہلے پہل

ملازمین کی ٹریڈ یونین کا ورکر بن گیا۔ سرکاری کاموں میں رخنہ ڈالنا اس نے اپنا معمول بنایا تھا۔ دفتروں میں ہنگامے اور دھنگے کروانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ کسی کی کھچائی کرنا۔ کسی آفیسر کا گریباں پکڑنا یا کسی عزت دار کی عزت کو تارتار کرنا اس کا خاصا تھا۔ اسلئے جلد ہی ملازمین میں مقبول ہوگیا۔ اور ٹریڈ یونین کے باثر لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔ دوران ملازمت لیڈری کم اور حرام خوری زیادہ کرتا تھا۔ بلا امتیاز عام لوگوں اور چھوٹے ملازمین کو کسی بھی بہانے پھنساتا تھا اور ان سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھ لیتا تھا۔ ہنستے لوگوں کو بہت رلاتا تھا اور غم زدہ لوگوں کی دل جوئی کے بدلے ان کا کلیجہ جلاتا رہتا تھا۔ یہ انسداد کورپشن میں کئی بار پھنسا لیکن ہمیشہ چھوٹ جاتا تھا۔ کیونکہ کورپٹ نظام میں ایسے نام نہاد لیڈروں کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔ ان کے غلط کاموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ سرکاری آفیسر یہ سمجھ کر ایسے یونین لیڈروں کو ہڈی ڈالتے رہتے ہیں کہ سالم بھیڑ کھاتے وقت یہ ان پر بھونکیں گے نہیں بلکہ سامنے بیٹھے دم ہلاتے رہیں گے۔ اور خود پورا پورا بکرا بنا ڈکار لئے ہضم کر جائیں۔

پرانی بستی میں جہاں یہ رہتا تھا وہاں خارش زدہ کتوں کی بھر مار رہتی تھی۔ یہ جب بھی گھر سے نکلتا تھا یا گھر واپس آجاتا تھا تو یہ خارش زدہ کتے اس کے پیچھے بھونکتے رہتے تھے۔ وہ پتھر اٹھا اٹھا کر ان کو مارتا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔ جب تھک ہار کر اپنی راہ لیتا تھا تو یہ کتے آسمان کی طرف منہ کر کے زور زور سے رونا شروع کر دیتے تھے۔ اور بستی کے میلے کچیلے بچے اسے دیکھ کر ہنستے رہتے تھے۔ بستی کے گندے بچوں کی مذاق بھری کلکاریوں اور خارش زدہ کتوں کی ہڑبونگ سے یہ بہت زیادہ پریشان تھا اور اب یا جب اس خارش زدہ بستی سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔۔۔ پھر اس کے پاس بہت سارا پیسہ آگیا اور اس گندی بستی کو خیر باد کہہ کر یہاں نئی کالونی میں زمین خریدی۔ کوٹھی جیسا گھر بنایا اور عیش و آرام سے لیس ساری چیزوں کے ساتھ یہاں منتقل ہوگیا۔ لیکن تب اسے ذرا بھر بھی اس بات کا احساس نہیں

ہوا تھا کہ بستی سے جاتے وقت بستی کے وہ سارے خارش ذدہ کتے بھی اس کے ساتھ ہی منتقل ہو چکے تھے۔ اب جب بھی یہ اذان دینا شروع کر دیتا تھا تو کتے زور زور سے بھوکنا شروع کر دیتے تھے۔۔۔

رمضان کے مقدس مہینے میں یہ صبح وشام دو بار ریڈیو ضرور سنتا تھا۔ ایک سحری اور دوئم افطار کے وقت، کہ اس وقت ریڈیو سے اچھے اور نصیحت آموز پروگرام آتے تھے۔۔۔ کسی علاقے میں طاعون پھوٹ پڑا تھا۔ یہ اس نے ریڈیو سے سنا۔ وہاں بچے، عورتیں اور بوڑھے مر رہے تھے۔ ٹیکے، ویکسین اور علاج معالجہ بہت ہو رہا تھا۔ لیکن بیماری بڑھتی ہی گئی جوں جوں دوا کی۔ بیماری کی وجہ وہ کنواں تھا جس کا پانی پورا علاقہ پیتا تھا اور اس کنویں میں کبھی کوئی کتا گرا تھا۔ کنواں گہرا تھا۔ پانی نکالا گیا پر کتا نہ نکال پائے۔ پھر اوپری اوپری صفائی ستھرائی کے بعد لوگ پھر سے کنویں کا پانی پینے لگے۔ پر کئی سالوں کے بعد علاقے میں بیماری پھوٹ پڑی اور لوگ مرنے لگے۔ اس پر کسی برزگ نے کہا تھا

''ارے اللہ کے بندو پہلے کنویں سے کتے کو تو نکالو۔ تب دوادارو کام کر پائے گا۔''

یہ واقعہ تیر کی طرح سیدھا اس کے دل پر لگا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ بہت کھوج لگائی۔ اپنے من میں جھانک کر دیکھا۔ تو دھنگ رہ گیا۔ یہ کتوں کی ہڑ بونگ اس کے اندر سے ہی ہو رہی تھی۔ پرانی بستی کے وہ سارے خارش ذدہ کتے اس کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ اور گندے گندے بچوں کی کلکاریاں اس کے رگ وریشے سے ابھر رہی تھیں۔۔۔

رمضان کا پورا مہینہ خود کو گھر میں اسیر کر کے رکھ دیا۔ نہ اذان دی اور نہ ہی کسی معاملے میں دخل دیا۔ چپکے سے مسجد جاتا اور چپکے سے واپس گھر آ جاتا۔ کالونی کے لوگوں نے بہت بار پوچھا۔ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر چپ سادھ لی۔ پورا مہینہ من کے کنویں سے خارش ذدہ کتوں کو باہر نکالتا گیا۔ گدھلا اور میلا پانی سارا باہر نکالا۔ آج عید کا چاند دیکھا گیا۔

وہ رات کے پچھلے پہر مسجد گیا۔ سجدے میں گرا اور بہت رویا۔ پھر ملے جلے خوف اور امید کے جذبے کے ساتھ لوڈ اسپیکر کا سوئچ آن کیا اور اذان دی۔ وہ رقت آمیز اذان میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ نہ کسی طرف اس کا خیال بٹکا اور نہ کہیں سے کوئی کتا رویا تھا۔ آج مسجد میں باقی دنوں سے زیادہ لوگ آ گئے تھے اور اس کو گلے لگا لگا کر عید کی مبارک باد دے رہے تھے۔۔۔

☆☆☆

چسکا

''میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔کاش تم بھی ایک بار دل سے اقرار کرتے۔؟''

''کرتا ہوں نا۔تم کیوں نہیں سمجھتی۔!''

''کیسے سمجھوں، جب بھی تیرے قریب آنا چاہتی ہوں۔تم ہزاروں میل دور بھاگ جاتے ہو، کہیں دور نیل گگن میں گُم ہو جاتے ہو۔ مجھے تنہا، تڑپتا، جذبات کے سمندر میں دفن کر کے خود کہیں دور ایک تماشائی بن کے بیٹھ جاتے ہو۔ اب آؤ نا۔ میرے قریب آؤ نا۔ پلیز زززززز''

لارا کے منہ سے جذبات سے بھری سسکیاں نکل رہی تھیں، اُس کی نیم خوابی آنکھوں میں دعوتِ ہوس نمایاں تھی۔ وہ جذبات سے مغلوب ہوکر سرتاج کا سارا رس اپنے اندر جذب کرنے کے لئے بے قرار لگ رہی تھی۔ اور سرتاج کا جسم لارا کی تپش سے پگل رہا تھا۔ جو کسی بھی وقت اپنے نیم شب خوابی کے لباس سے باہر آنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ ۔۔۔سرتاج کا بیڈروم خوبصورت اور سجھا سجھایا تھا۔قیمتی فرنیچر سے آراستہ کسی شہزادے کی خواب گاہ سے کم نہیں تھا۔۔۔۔سارا کمرہ معطر لگ رہا جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی نئ نویلی دلہن خوشبو بکھیر کر نکل گئی ہو۔۔۔کمرے میں ابھی بھی لارا کی سرگوشیاں ابھر رہی تھیں اور سرتاج بڑی مشکل سے اپنے ۵۵ سالہ جسم کو سنبھالے سے بھی نہیں سنبھال پا رہا تھا۔۔۔

سرتاج اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔اچھی نوکری ملنے کے ساتھ ہی شاذیہ جیسی خوبصورت اور خوب سیرت شریکِ حیات ملی تھی۔ پھر جب گھر میں عامر اور آسی کی کلکاریاں گونج اُٹھی، تو اس کی دنیا جیسے مکمل ہوگئی۔اس کی خوشحال زندگی پر سارے یار دوست اور اقرباء رشک کرتے

تھے۔ کچھ لوگوں کے نصیب میں خوشیوں کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے، اور ان کی زندگی میں اچانک خوشیوں کا سورج سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ جبھی تو سرتاج کی ساری مسرتیں آفتِ ناگہانی کی شکار ہوگئیں۔ اس کی دنیا ہی اُجڑ گئی۔ شاذیہ عالمِ جوانی میں ہی اُسے داغِ مفارقت دے گئی۔ جس کی وجہ سے سرتاج کی مضبوط ازدواجی زندگی تار تار ہوگئی۔ لیکن معصوم بچوں کا مستقبل اس کے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اپنے بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم پر نچھاور کردی۔ بچے بھی بڑے ہوشیار اور ہونہار نکلے۔ وہ اچھے نمبرات سے پاس ہوتے گئے اور مزید پڑھائی کے لئے بیرونِ ملک چلے گئے۔ اس کو اب ان کی زیادہ ہی فکر لگی رہتی تھی۔ روز فون کرنا، ان کی خیریت پوچھنا، پڑھائی کے بارے میں معلوم کرنا اور نصیحتیں دینا اس کے معمول میں شامل تھا۔۔۔ عامر اور آسی اب اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ زندگی کے سب سے بڑے فیصلے بھی اب وہ خود ہی کرنے لگے تھے۔۔۔ عامر نے ایک یوکرین لڑکی سے شادی کرلی اور وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ آسی دہلی کے ایک لڑکے کی دیوانی ہوگئی اور اس کے ساتھ شادی کرکے دہلی چلی گئی۔۔۔ سرتاج اکیلے پن کا اسیر ہوکر رہ گیا۔ یہ اکیلے پن کا سمندر دن بدن اپنا دامن پھیلاتا جارہا تھا اور سرتاج اس میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ پہلے پہل بچوں کے فون کال ہفتے میں ایک بار آجاتے تھے۔ پھر مہینوں کے بعد آنے لگے اور اب کبھی کبھار ۔۔۔۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک دن عامر یوکرین سے بھاگ ہی آیا اور رشین بیوی کو چھوڑ کر ایک ہندوستانی منسٹر کی بیٹی نرملا سے شادی کرلی۔ عامر اور نرملا دونوں ڈاکٹر تھے اور دہلی میں جاب حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اب عامر اور آسی ایک ہی شہر میں رہ رہے تھے اور دونوں بھائی بہن اکثر ملتے رہتے تھے۔ اس دوران سرتاج پر کیا بیتی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ اکیلا تنہائیوں کے گہرے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا اور اس کی اپنی دنیا بہت محدود اور تنگ ہوکر رہ گئی تھی۔۔۔

انسان کی زندگی کتنی بھی محدود اور مسدود ہوکر رہ جائے ۔لیکن وہ وہاں بھی اپنے جینے کے کچھ نہ کچھ ذرایع نکال ہی لیتا ہے۔اور اپنی تنہائیوں کو خوش رنگ اور خوش ذائقہ بنانے کے جتن کر ہی لیتا ہے۔۔۔۔ ہر زمانے میں پھیکی پھیکی ، بدمزا اور بے رنگ زندگی میں خوشنما رنگ بھرنے کے مختلف طریقے رائج رہے ہیں اور آج کے دور میں بھی ایسے مختلف اور منفرد رنگ موجود ہیں جو لوگوں کی دلچسپی کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لئے کتابیں تو کچھ کے لئے کمپیوٹر،کوئی انٹرنیٹ کا شیدائی تو کسی کے لئے وٹس ایپ ضروری۔۔۔فیس بک تو سب سے زیادہ لوگوں کا مشغلہ ہے اور انٹرٹینمنٹ کا دلکش ذریعہ بھی۔۔۔

سرتاج کا پچپن سالہ سفر یوں تو اسے بہت زیادہ لمبا لگ رہا تھا۔لیکن وقت کے تیز اور کرخت تھپیڑوں کا کوئی بھی نشان اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آج بھی حسین اور خوبرو جوان دکھ رہا تھا۔ اگر چہ اس کے گھنگرالے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھلکنے لگی تھی لیکن وہ اس کی سنجیدہ شخصیت میں اور زیادہ نکھار پیدا کر رہے تھے۔ وہ آج بھی کئی دلوں کی دھڑکن بن سکتا تھا۔لیکن اکیلے پن نے اس کو کبھی بھی ان چیزوں کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہں دیا تھا۔۔۔اب اس کی بے آب وگیاہ زندگی اور تنہائیوں کے صحرائے لق ودق میں فیس بک بہار بن کر آ گیا تھا۔۔۔ وہ رات گئے تک فیس بک استعمال کرنے لگا۔۔۔ خوبصورتی کا دلدادہ تو وہ پہلے سے ہی تھا۔اس کے پوسٹس بھی بڑے خوبصورت اور دلکش ہوتے تھے۔ وہ لکھتا خوب تھا۔ دن بدن اس کے دوستوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔اور یوں ایک دن وہ فیس بک پر ہردل عزیز شخصیت بن گیا تھا۔۔۔۔ یہاں ملک ملک،شہر شہر اور آس پڑوس سے سینکڑوں لوگ اس کے دوست بن رہے تھے۔ جن میں سبھی مرد و زن، چھوٹے بڑے، کالے گورے اور مختلف فکر ونظر کے لوگ شامل تھے۔۔۔۔۔ایک کم گو،تنہا اور سماج سے الگ تھلگ رہنے والے انسان کے لئے اپنے خیالات ،احساسات اور جذبات کو منتقل

کرنے کا یہ ایک اچھا ذریعہ مل گیا تھا ۔۔۔۔سرتاج کو بھی اپنے دل کی چاہت کے اظہار کا کئی بار موقعہ ملا لیکن وہ اقرارِ محبت سے سے بہت گھبراتا تھا۔۔۔ پھر ایک دن اس کی زندگی میں لارا آ گئی۔جس نے سرتاج کے دل کے سارے انجر پنجر کھول کے رکھ دیئے اور ذہن کے دریچے وا کر دیئے۔ لارا برازیل کی رہنے والی تھی۔ وہ وہاں کے ایک مشہور اخبار کی کارسپانڈنٹ تھی۔دونوں ایک دوسرے کی تحریوں میں دلچسپی لینے لگے اور لارا کے توسُل سے سرتاج کے کئی مضامیں بیرونِ ملک کے اخبارات میں بھی شایع ہونے لگے تھے ۔۔۔ تحریروں کی دلچسپیاں تصویروں پر آ کر ٹھہر گئیں۔۔۔ پھر آنکھوں، ہونٹوں اور زلفوں کی گرہ گیر کی باتیں ہونے لگی، ایک دوسرے کے پیار میں کھو جانے کے رومان انگیز عہد وقرار، رسیلی صبح اور رنگینی شام کی شبنمی قطروں پر خراما خراما چہل قدمی کی چاہت اور نیلے آکاش میں بادلوں کے سنگ تیرنے کے سپنے۔۔۔پھر کچھ عہد و پیاں،قرابت اور قربت کے مزے، نہ بچھڑ جانے کی یقین دہانیاں اور ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں۔۔۔۔۔اس سب کے باوجود سرتاج کو ایک انجانا سا ڈر اور غیر یقینی سا خوف پریشان کئے ہوئے تھا جو لارا نے بھی کئی بار محسوس کیا اور وہ برابر بولتی جا رہی تھی۔

''سرتاج میں جانتی ہوں تم بھی میری طرح ہی مجھ سے پیار کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تم خوف زدہ ہو۔ یہ خوف تم سبھی مشرقیوں کی فطرت میں رچا بسا ہے۔تم سے پیار کرتے کرتے میں تم لوگوں کی نفسیات بھی پڑھتی رہی ہوں۔دینا بھر میں تم لوگوں پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں اور مجھے اس میں جو بات سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ یہ کہ تم لوگوں میں پیار محبت کا جذبہ باقی دنیا کے لوگوں سے بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔پیار کو اپنے منطقی انجام تک لے جانے کی چاہ تم لوگوں میں بہت زیادہ ہے۔لیکن تم کو محبت کی ڈگر پر لانے کے لئے بہت سارے جتن کرنے پڑتے ہیں۔کیوں کہ تم ڈرپوک ہو۔۔۔ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہو۔''

گھر میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔آ سی اور عامر نے تو آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔۔۔۔اور سرتاج ایک بڑے گنہگار کی طرح اپنے ہی بچوں کے سامنے کھڑا تھا۔اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ ندامت سے آب آب ہو رہا تھا۔اس کے بچوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔اوران کے منہ سے باپ کے خلاف بہت سارا اناپ شناپ نکل رہا تھا۔۔۔

''پاپا کچھ تو شرم کرو'' آسی نے دانتوں تلے انگلیاں دبا کر کہا۔۔

دہلی میں بہت زیادہ گرمی پڑنے کی وجہ سے دونوں بہن بھائی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ کشمیر آ گئے تھے۔کشمیر گھومنے کے بہانے اپنے باپ سے بھی ملنے آ گئے تھے۔۔۔اب واپس جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔۔۔۔صبح کسی کام کے سلسلے میں آسی نے کمپیوٹر کھولا تو سامنے سرتاج کا فیس بک پیج کھلا پڑا تھا۔۔۔سرتاج رات میں فیس بک لاگ آوٹ کرنا بھول گیا تھا۔۔۔۔۔ مسیج بکس پر کئی سرخ سرخ نمبر جگمگا رہے تھے۔۔۔انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔سامنے کوئی انہونی بات ہو تو اسے جاننا ناگزیر بن جاتا ہے۔چاہئے وہ بات لاکھ گرہ باندھ کر بھی کیوں نہ رکھی گئی ہو۔۔۔آسی کو بھی اپنے باپ کے پوشیدہ پیغامات (سکرٹ مسیجز) کھولنے کا بہت زیادہ من کر رہا تھا۔ پر وہ اپنی اس بے ہودہ خواہش کو دبانے کی لاکھ کوشش کر رہی تھی۔لیکن خواہش تھی کہ بار بار اُبھر کر سامنے آ رہی تھی اور ضد بن کر اس کے ذہن ودل میں تلاطم بپا کر رہی تھی۔آخر نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اِن بکس پر کلک کر ہی دیا۔سامنے کئی لوگوں کے پیغامات پڑے تھے۔جس میں اس کے چند پوسٹس کی تعریفیں، کچھ خیر وخبر کی باتیں، کچھ لڑکیوں کی تصاویر اور پیار محبت کی باتیں۔لیکن جب آسی نے لارا کا مسیج بکس کھولا تو وہ اسے کھولتی چلی گئی۔اپنے باپ اور لارا کے بیچ ہو رہے مقالے اُس کو ایک سیدھ بیٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ پہلو پر پہلو بدلتی جا رہی تھی۔ جوں جوں سطریں کھلتی جا رہی تھیں،اس کے اندر خون کا پارہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔اس کا چہرا لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ایسا

لگ رہا تھا کہ اب یا جب اس کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔اس نے جلدی سے کمپیوٹر بند کر دیا اور پیر پٹک کر باہر نکل گئی ۔۔۔

بات جہاں سے شروع ہوگئی تھی وہیں پر دب گئی تھی۔۔۔سبھی لوگ آئیر پورٹ پر کھڑے تھے۔سرتاج خود ہی ان کو آئیر پورٹ تک اپنی گاڑی میں لے کر آیا تھا۔سامان کی جھانچ پڑتال کے بعد سرتاج نے سب سے اجازت لی۔داماد اور بہو کو پیار کرنے کے بعد وہ اپنے بچوں کی طرف مڑا تو ایک قدم اٹھانے کے بعد ہی جیسے اس کے پیر زمین میں دھنس چکے تھے۔ وہ لاکھ کوشش کے بعد بھی ان کی طرف دوسرا قدم نہ بڑھا سکا۔اس نے نگاہ اُٹھا کر اپنے بچوں کی طرف دیکھنا چاہا لیکن ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے میں شرمندگی کے منوں من احساس تلے اس کی نظریں لوٹ کے آگئیں اور سامنے سنگلاخ زمین میں گڑھ گئیں۔۔۔ وہ ایک دم پیچھے مڑ گیا اور تیزی کے ساتھ باہر آ گیا۔۔۔

''پاپا۔۔!!! '' آسی کی آواز نے سرتاج کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔وہ رک گیا۔پیچھے کی طرف مڑا۔آسی بڑی تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سرتاج کے سینے سے لگ کر وہ زار زار رو رہی تھی۔

''پاپا۔۔۔پاپا مجھے معاف کرو۔۔۔مجھے معاف کرو'' سرتاج نے اپنی نرم انگلیوں سے آسی کے آنسوں صاف کر دیئے،سامنے احساسِ ندامت کے بوجھ تلے دباء عامر کھڑا تھا۔ سرتاج نے مسکرا کر اس کی طرف اپنے بازو کھول دیئے۔وہ بھی دوڑ کر آیا اور اپنے باپ کے سینے سے لگ کر دیر تک معافی مانگتا رہا تھا ۔۔۔۔

آج سرتاج رات گئے تک فیس بک پر جما رہا۔۔۔لارا سے ڈھیر ساری باتیں بھی ہوگئیں۔وہ کئی بار جذبات کے سمندر میں ہچکولے کھاتا رہا۔کئی بار گہرے بھنور میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔۔۔کمرہ معطر تھا اور لارا کی سسکاریاں صبح تک کمرے میں گھونج رہی تھی۔۔۔لیکن

اب کی بار وہ کمپیوٹر بند کرنے سے پہلے ساری مسیجز ڈیلیٹ کرنا نہیں بھولا تھا۔۔۔

☆☆☆

آسودہ حال

وہ بازارِ حسن سے بن سنور کے نکل آئی تھی اور سارے شہر پر بجلیاں گرانے کا ارادہ رکھتی تھی ۔۔۔۔ وہ جوان تھی ، خوبصورت تھی اور دلکش ناک نقشے والی تھی ۔۔۔ غازہ ملنا ، بالوں کو لہرانے کے لئے کھلا چھوڑنا، سجنا، سنورنا اسے وراثت میں ملا تھا۔۔۔۔

وہ جہاں سے آئی تھی، وہاں کبھی پالکیاں ، تانگے پھر موٹر گاڑیاں آ کر رکتی تھیں ۔۔۔اور فانوس میں چمکتے قمقموں کے درمیان رنگین محفلیں سجتی تھیں ۔۔۔ جہاں کی رونقیں عروج پر رہتی تھیں۔وہاں اب ہُو کا عالم تھا اور افلاس برآمدوں میں محوِ رقص تھی ۔۔۔اب ویرانیاں ڈھیرہ جمائے بیٹھی تھیں ۔۔۔نہ اب وہاں نوابوں اور رائیسوں کی ہزار روپے والی گڈیاں لُٹانے کے منظر تھے ، اور نہ ہی بند سیلن زدہ کمروں میں سنِ بلوغ کو پہنچی باکرائی کلکاریاں سنائی دے رہی تھیں ۔۔۔کبھی جن کے پائل کی چھن چھن تبلے کی تھاپ پر دیکھنے والوں کو مدہوش کر دیتی تھی، وہ جوانیاں اب دم توڑ رہی تھیں ۔۔۔ان کے چہروں سے غازہ اتر چکا تھا، اور وہ اب گاہک کے انتظار میں دروازے پر یاس و نا امیدی کی نگاہیں جمائے بیٹھی رہتی تھیں ۔۔۔۔۔ برسوں کی جمع پونجی پیٹ کی دوزخ بجھاتے بجھاتے ختم ہو چکی تھی ۔۔۔۔۔

جب بھوک برداشت سے باہر ہوگئی ، اور پیٹ جلنے لگے ۔۔۔تو کوٹھے کی بڑی اماں کے فیصلے کے سامنے اُسے جھکنا ہی پڑا ۔۔۔ بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو سجایا سنوارا گیا،اور ہر زاویہ سے پرکھنے کے بعد اسے گاہک کی تلاش میں بازارِ حسن سے نکال کر شاہ راہِ بے پُرسان پر ڈال دیا گیا۔۔۔۔

سڑکوں پر آمد رفت شروع ہو چکی تھی ۔۔۔بھیڑ یاس کی نشانی کی طرح پھیل رہی تھی ۔۔۔اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن چکا تھا۔ بازار میں اشیاء کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں ۔۔۔مہنگائی زوروں پر تھیں۔ لیکن لوگ خریداری میں دل و جان سے جٹ رہے تھے ۔۔۔۔۔ ہر طرف بھاگم دوڑ مچی تھی ۔لوگ دوڑ رہے تھے ۔۔ بھاگ رہے تھے ۔۔۔کوئی کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا ۔۔۔۔سب کو اپنی اپنی فکر لگی تھی ۔۔۔۔۔ ایک دوسرے سے بے فکر ،ایک دوسرے سے بے پروا ۔۔۔۔۔

صبح جب وہ بازار میں آئی تو وہ ہشاش بشاش گھوم رہی تھی ۔دو پہر تک اُس کی سبک رفتاری دھیمی پڑ چکی تھی ۔۔اور شام ہوتے ہوتے وہ تھک کر چور ہوگئی تھی ۔۔۔اس کے چہرے سے غازہ اُتر چکا تھا۔۔۔ بال گرد وغبار سے آلودہ ہو گئے تھے ۔۔۔۔اور ہونٹوں پر یاس اور ناامیدی کی کھُرنڈ جم چکی تھی ۔۔۔بھرے بازار میں کسی نے بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔۔۔ نہ اسے دیکھ کر کسی آنکھ میں چمک آئی تھی ،اور نہ ہی کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ وہ حیران تھی ، پریشان تھی ۔۔۔اور پھر جب وہ بھرے بازار سے نامراد ہوکر لوٹ کر واپس کوٹھے پر پہنچی، تو بوڑھی اماں حسرت سے بولی۔

''تف ہے ۔۔ یہ آدمی کو ایسا کیا نعم البدل ملا ہے ۔جو یہ بازارِ حسن ،کوٹھے کے گھنگرو اور تبلے سے اتنا بے زار ہو گیا ہے ۔؟؟؟''

بوڑھی اماں شاید اس بات سے بے خبر لگتی تھی کہ آج کا انسان آسودہ حال ہو چکا ہے ۔عیاشی کے سارے شغل اب اس کے چاٹ بکس میں محفوظ ہیں ۔اور دوری ۔۔۔صرف ایک کلک !!!

☆☆☆

ببول

حسن پور کا خوبصورت گاؤں حیات ندی کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ صاف و شفاف پانی کی ندی جو اوپر پہاڑی ڈھلوان سے بل کھاتی اور اِتراتی ہوئی اُتر آتی تھی، جیسے کوئی خوبصورت باقرہ کمر لچکاتی اور پائل کی چھن چھن سے مدھر ساز بجاتی ہمارے کانوں میں رس گھولتی آ رہی تھی اور ہمارے گاؤں کی ایک ایک کیاری کو سیراب کرتی اور ہماری پیاس بجھاتی ایک شانِ ادا کے ساتھ آگے بڑھ جاتی تھی۔حسن پورا نہی پہاڑی ڈھالوانوں اور حیات ندی کا ایک حصہ تھا۔ جو قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔گاؤں تک آنے جانے کا ایک لمبا اور آبڑ کھابڑ پہاڑی راستہ تھا جو کچھ اور اوپر جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ پھر اوپر تا حد نگاہ سرسبز میدان تھے۔دراز پہاڑی سلسلہ تھا اور جنگل ہی جنگل تھے۔اس خوبصورت گاؤں کا ایک اکلوتا مالک بھی تھا۔ چودھری حیات خان ۔۔۔ یہاں کی ساری چراگاہیں۔ یہاں کے مال مویشی، یہ جنگل، یہ پہاڑ اور ہم،سب اسکی ملکیت تھے۔

میں حسن پور کے ایک غریب کسان کا کمزور بیٹا تھا۔گاؤں کا کوئی بھی فرد چودھری حیات خان کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کرسکتا تھا۔لیکن لوگ چودھری سے زیادہ اس کی ماں بڑی چودھرائن سارہ بی بی اور اس کی بیوی چھوٹی چودھرائن حاجرہ بی بی سے ڈرتے تھے۔ گاؤں میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ ان دونوں کے سامنے کھڑا رہ سکتا۔چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ان کی سزائیں بڑی خوفناک ہوتی تھیں ۔۔۔بات صرف مرنے مارنے تک ہی ہوتی تو مسئلہ کوئی نہیں تھا۔ یہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ تو ہر روز موت سے کھیلتے رہتے تھے۔ لیکن مارنے سے پہلے چودھرائن جو سزائیں دیتی تھیں۔ وہ بڑی عبرت ناک ہوتی تھیں۔

چودھری خود بھی ڈرا سہارہتا تھا۔ وہ اپنی ماں بڑی چودھرائن سے بہت زیادہ ڈرتا تھا۔ اور کچھ کچھ اپنی بیوی چھوٹی چودھرائن سے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔ وہ تو اپنی بیوی حاجرہ بی بی سے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا جب وہ بڑی چودھرائن کے ساتھ بیٹھی ہوتی تھی ۔۔۔لیکن چودھری کا اپنی ماں اور بیوی سے ڈرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی ۔۔۔ چودھری حیات خان کا عشق ۔۔۔ وہ گاؤں کے ایک غریب آدمی سلام کمہار کی خوبصورت بیٹی نازنین سے پیار کرتا تھا۔ نازنین پہلے اس کی محبوبہ تھی ۔ پھر اس کی بیوی بن گئی ۔ جب حیات خان اور نازنین کے پیار کی مشک اڑتے اڑاتے بڑی چودھرائن سارہ بی بی کی ناک تک پہنچی ،تب تک اس میں اتنی ملاوٹ ہو چکی تھی کہ یہ مشک خوشبو سے بدبو میں بدل چکا تھا۔ جس وجہ سے بڑی چودھرائن نے مضبوطی سے اپنی ناک بند رکھ دی تھی ۔اس کی بہو حاجرہ چودھرائن '' جسے بڑی چودھرائن سارہ بی بی نے اپنی بہن سے مانگ کر لایا تھا۔'' وہ نازنین کے خلاف بدبودار روئی ساس کی بند ناک کے ساتھ رگڑتی رہتی اور اس کے کانوں میں زہر انڈیلتی رہتی ۔اس نے بڑی چودھرائن سے یہ فیصلہ بھی صادر کروالیا تھا کہ چودھر حیات خان اپنی دوسری بیوی نازنین کو اپنے گھر نہیں لاسکتا۔ البتہ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے اس کے میکے یعنی سلام کمہار کے گھر جاسکتا تھا اور ہفتہ کی رات اس کے ساتھ گذار سکتا تھا۔لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی گئی تھی کہ نازنین کسی بچے کو جنم نہیں دے سکتی ۔ اگر وہ کبھی کسی بچے کو جنم دے بھی دے گی ۔ وہ بچہ چودھری خاندان کا چشم و چراغ نہیں بن سکتا۔ نہ اسے خاندان کا ورث ہی تصور کیا جاسکتا تھا ۔

گاؤں میں آٹھویں تک اکلوتا اسکول بھی تھا جو چودھری کے ہی ایک مکان میں بنایا گیا تھا۔ یہاں بھی گاؤں کے بچے کم اور چودھری کے خاندان کے بچے زیادہ پڑھتے تھے ۔ ویسے بھی گاؤں کا کوئی بچہ آٹھویں تک نہیں پڑھ پاتا تھا۔ یا اگر کوئی آٹھوین جماعت پاس کر بھی لیتا تھا تو اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی ۔ گاؤں کے کسی کسان میں اتنی

سکت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو مذید پڑھائی کرنے کے لئے شہر بھیجتا۔ گاؤں سے صرف چودھرحیات خان کے دو بیٹے اوراس کی بیٹی سلما ہی پڑھنے کے لئے شہر گئے تھے۔ میں اپنے ماما کے پاس کچھ کام کرنے کے لئے شہر آیا تھا۔لیکن شہر آ کر جب ماما نے میری قابلیت دیکھی تو اس نے مجھے آگے پڑھائی کے لئے شہر کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا۔ کامیابیاں میرے قدم چومتی گئیں اور میرا داخلہ ایم بی اے میں ہوگیا۔ یہاں چاروں طرف میری قابلیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ چودھری کی بیٹی سلما بھی یہاں کی طالبہ تھی۔ گاؤں کی یہ خودسرا اور ہمیشہ ناک بھنویں چڑھا کر رکھنے والی لڑکی یہاں کسی شمار قطار میں بھی نہیں تھی۔۔۔ جب انسان کو یہ لگتا ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تو وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے۔ اور اس جھنجلاہٹ میں وہ ایسا کچھ کر دیتا ہے جو اس کے اصولوں کے منافی ہوتا ہے۔ سلما بھی جھنجلاہٹ کے ساتھ ساتھ تنہائی کی شکار تھی اوراس تنہائی کو بانٹنے کے لئے وہ میرے قریب آ گئی تھی۔ میرے قریب آنے کا اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ میں اس کے گاؤں کا تھا اور میں اس کے سامنے اسی طرح جھکا بھی رہوں گا جس طرح گاؤں والے ان کے سامنے جھکے رہنے کے عادی تھے۔ اس کی تنہائی بھی بٹے گی اور اس کی خودسری اور انا بھی بچی رہے گی۔لیکن مجھ پر اب کسی کی خودسری اثر انداز نہیں ہوتی تھی کیونکہ میری تعلیمی قابلیت نے مجھے سب سے زیادہ خودسرا اور انا پسند بنا دیا تھا۔۔۔ سلما کا میرے قریب آنا میری تنہائیوں میں تسکین کا سامان بن سکتا تھا۔ میری خشک راتیں رنگین بن سکتی تھی۔ میں اسے پھانسنے کے لئے اس پر پیار کا جال پھینکتا گیا اور وہ پھنستی چلی گئی۔ یوں تو سلما کو پھانستے وقت میرے لاشعور میں کہیں تھوڑا سا ڈرا ور خوف بھی موجود تھا کہ اگر کچھ ایسا ویسا ہوگیا تو گاؤں میں میرے ماں باپ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ وہ ظالم چودھرائن کے عتاب کے شکار بھی ہوسکتے تھے۔ لیکن سلما کا شباب میری سوچ وخرد پر بھاری پڑ رہا تھا اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی میں اپنے

ہوس کے بدمست ہاتھی کی نوکیل کس نہ سکا۔اور ایک شام میں سلما کو زیر کرنے کے قریب پہنچ بھی گیا تھا۔کہ اچانک جیسے اس میں کسی ڈائن چودھراین کی بدروح گھس آئی تھی۔اس نے ایک زناٹا دار تھپڑ میری بائیں گال پر جڑ دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔اور جب تک میں سنبھل پاتا تب تک وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔بات ہم دونوں کے بیچ ہی رہتی تو کوئی ڈر نہیں تھا۔لیکن اس کے کمرے سے باہر جاتے جاتے میری رسوائی کی بات ہمارے گاؤں تک پھیل چکی تھی۔ میرے ماں باپ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ چودھری حیات خان سے زیادہ بڑی چودھرائن سارہ بی بی انہیں سزا دینے کے در پے تھی۔وہ ان دونوں کو مار ہی ڈالتی، کہ چودھری کی محبوبہ نازنین نے مداخلت کی اور ان کی جان بچ گئی۔لیکن انہیں اپنے گاؤں سے جلائے وطن ہونا پڑا تھا۔وہ بڑی کسم پرسی میں شہر ماما کے گھر پہنچے تھے۔۔۔اس دوران ایم بی اے کے امتحانات ختم ہوتے ہی مجھے ایک بڑی کمپنی میں جاب لگ گئی۔اور میں دوسرے شہر منتقل ہوگیا۔میرا ایم بی اے کا رزلٹ آگیا تو میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ پاس ہوگیا۔کمپنی نے میرے پاس ہونے کی خوشی میں مجھے کنفرم کردیا۔راتوں رات میرا اسٹیٹس بدل گیا۔کہاں وہ گاؤں کا گھاس پھوس والا گھر،شہر میں ماما کا وہ سیلن زدہ کمرہ جہاں دم گھٹتا تھا۔۔۔اب میرے پاس ساری آسائشوں سے آراستہ خوبصورت فلیٹ اور آفس جانے آنے کے لئے ایک بڑی سی گاڑی تھی۔صرف ایک سال کے بعد کمپنی کے مالک میری صلاحیتوں کے قائل ہو چکے تھے۔وہ میرے سارے دیئے پراپوزلز آنکھ بند کر کے پاس کرتے تھے۔مجھے اپنی قابلیت پر بڑا ناز ہو رہا تھا اور اب میرے چھوٹے سے ایم بی اے دل میں بھی ایک بڑی ملٹی ملینیر خواہش جنم لے رہی تھی کہ کاش میں بھی ایک بڑی کمپنی کا مالک بن سکتا اور اپنے مالکان کی طرح میں بھی سوسائیٹی میں لکھ پتی،کروڑ پتی کہلاتا۔۔۔

آج میرے ایک بڑے پراپوزل کی وجہ سے میرے مالکان بہت زیادہ خوش

ہو گئے تھے۔اس خوشی کو بانٹنے کے لئے وہ مجھے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے آئے۔ یہ میرے لئے ایک دم نئی دنیا تھی۔یہاں وہ سب کچھ تھا جو میں نے چند ایک فلموں میں دیکھا تھا۔یہاں عالی شان بار تھا۔رنگین کیبرے تھا۔اور میرے لئے بہت ہی مہنگا سویٹ بک کیا گیا تھا۔میں شراب میں دھت تھا اور ایک ویٹر کی مدد سے کمرے میں پہنچا۔شراب سے زیادہ میں اپنی کامیابی کے نشے میں چور تھا اور اس نشے سے شاید میں صبح تک بھی باہر نہ آپاتا کہ اچانک دروازکھلا۔اور ہوا میں لہراتے بالوں اور ہلکے ریشمی لباس زیب تن کئے ایک اپسرا میرے کمرے میں آگئی۔اس کے بدن سے اٹھتی خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو گیا تھا۔۔۔ میں اسے دھندلی نظروں سے دیکھنے لگا ۔۔۔

''اووووہ۔۔۔یہ کون ہے۔۔۔ اپنے چودھری کی بیٹی۔۔۔سلما۔۔۔میرے کمرے میں۔۔۔یا سلما جیسی کوئی اور اپسرا۔۔جانے مجھے ہر لڑکی میں سلما ہی کیوں نظر آتی تھی۔۔۔سلما۔ہمارے چودھری حیات خان کی بیٹی جو میرے ذہن و دل پر میری کامیابی کے نشے کی طرح چھائی ہوئی تھی۔۔۔جو میری ہر اک سانس میں رچ بس چکی تھی۔۔۔جو میری رگ رگ میں شراب کی طرح دوڑ رہی تھی۔۔۔جو۔۔۔نا نا۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔ کرتے میری باہوں کی مضبوط گرفت سے مچھلی کی طرح پھسلتی نکل گئی تھی اور میرے چہرے پر وہ زناٹے دار تھپڑ رسید کر گئی تھی جس کی گرم گرم تپش آج بھی میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔آج بھی جب میں صبح یا شام آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا،تو اس کے ہاتھ کی وہ قلم ایسی انگلیاں میری گال پر ابھرتی ڈوبتی نظر آتی تھیں۔۔۔اور بے خودی میں بھی میرا ہاتھ میرا گال سہلاتا رہتا تھا۔۔۔

میں ہر لمحہ ہر وقت سلما کو ہی سوچتا رہتا تھا اور اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔اگر چہ میں سلما کے نام پر روز سلما جیسی کسی نہ کسی لڑکی کو بھنبوڑتا،نوچتا رہتا تھا،جانے پھر

بھی سلما کے محبت کی پیاس کیوں نہیں بجھتی تھی۔سلما میرا پیار۔۔۔میری محبت۔۔۔نہیں۔ نہیں سلما میری محبت نہیں۔وہ میرا پیار نہیں۔میری ضد تھی۔ہاں وہ ضد بن کر میرے ذہن و دل میں تلاطم برپا کئے ہوئے تھی۔میری انا اور میری خودسری کی ضد۔۔۔

آخر میں اپنی ضد کے سامنے ہار گیا اور میں نے اپنے ماں باپ کے سامنے اپنی زندگی کا سب سے بڑا پراپوزل رکھ دیا۔۔۔پر یہ کیا میرے ماں باپ کے ساتھ ساتھ میرا ماما بھی پریشان ہو گیا۔تینوں ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔۔وہ حیران و پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں ان کی حیرانی پر حیران ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔آخر میرے ماما نے دوٹوک لفظوں میں میرا لائف پراپوزل مسترد کر دیا۔

''نہیں۔۔۔یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔کبھی بھی نہیں۔'' میں غصے سے اپنے ماما کو دیکھنے لگا اور غصے میں ہی اپنی نگاہیں اپنے ماں باپ کی طرف پھیر لیں۔وہ دونوں مجرموں کی طرح نظریں جھکائے ناخنوں سے قالین کھرچ رہے تھے۔میں تھوڑی دیر دونوں کو دیکھتا رہا اور وہ لگاتار مجھ سے نظریں چرا رہے تھے، تو میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ ماما سے کہہ دیا۔

''ماما۔۔۔اگر تم لوگ چودھری حیات خان سے مرعوب ہو تو میں آپ کو بتا دوں۔اس کی چودھراہٹ اپنے گاؤں تک ہی محدود ہے۔ باقی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اس کے لئے یہ فخر کی بات ہے جو میں اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہا ہوں۔۔۔ ایک بات اور بتا دوں اگر وہ بھی آپ لوگوں کی طرح اسی چودھراہٹ کے زعم میں مبتلا ہے۔تو میں اس کی اجازت کے بغیر بھی یہ شادی کر کے رہوں گا۔۔۔

''نہیں بیٹا نہیں۔۔۔ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔تم ایسا نہیں کر سکتے'' میری ماں نے روہانسی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

'' کیوں نہیں ماں ۔۔۔ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ ہماری شادی کیوں نہیں

ہوسکتی۔۔۔ ماں بولو۔۔۔ بولو ماں بولو۔۔۔'' میں نے ماں کے دونوں کندھے پکڑ لیئے اور اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''کیونکہ تم چودھری حیات خان کا خون ہو۔ سلام کمہار کی بیٹی نازنین اور چودھری حیات خان کے بیٹے ہو۔ تم بڑی چودھرائن کے حکم کے مطابق ان کے گھر کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ اس لئے بڑی چودھرائن سارہ بی بی نے تجھے میری گود میں ڈال دیا۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ کیونکہ میری کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں نے دل وجان سے تمہاری پرورش کی۔''

میری ماں میری بھلائیاں لے رہی تھی، میرا باپ بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ ماما بھی بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔۔۔ لیکن میرے ذہن ودل میں ہوائیاں چل رہی تھی۔ میری ایم بی اے والی سوچ کا احاطہ اور وسیع ہوتا جارہا تھا۔ میرے خیالوں میں ملٹی ملینیر کمپنیاں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ حیات ندی کے دونوں کناروں پر آباد حسن پور۔ او پرتا حدنگاہ سرسبز میدان۔ جنگلات۔ وہاں کی ساری چراگاہیں۔ مال مویشی اور لوگ، سب میری ملکیت۔۔۔

میری انا کی ٹوپی اور اونچی ہوتی جارہی تھی اور میری خودسری اب سر چڑھ کے بول سکتی تھی۔۔۔ سلما میرا تیز ہتھیار تھی۔ جو میں اب چودھری حیات خان اور اس کے خاندان کے گلے پر آرام سے پھیر سکتا تھا۔۔۔ اب مجھے کوئی بھی طاقت لکھ پتی، کروڑ پتی بننے سے نہیں روک سکتا تھا۔۔۔ میں ملٹی ملینیر

☆☆☆

مسیحائی

''رانا۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔ دکھا۔۔۔دکھا جلدی۔۔۔کیا چھپا رہی ہوتم''

''کچھ نہیں۔۔۔میں نہیں دوں گی۔۔ابو کے بالوں کی قسم۔نہیں دوں گی۔ ''

'' رانا۔۔۔دکھا دو۔کیا چھپا رہی ہوتم۔ابوابو۔دیکھو رانا کو' رانا کی بڑی بہن شازی باپ کو بلانے لگتی ہے۔

''رانا بیٹی کیا چھپا رہی ہو۔''

''ابو یہ میری انگوٹھی ہے۔آپ کے لئے۔'' محمد اقبال کوانگھوٹھی دکھاتے ہوئے

''اووومیرے لئے۔۔۔میرا پیارا بیٹا۔'' محمد اقبال چھوٹی رانا کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتا ہے۔اور رانا اس کے گنگھرالے بالوں سے کھیلتی ہے جو اسے بہت پسند ہیں۔وہ بات بات پر ابو کے بالوں کی قسم کھاتی ہے۔

''ھاھاھا۔۔۔یہ امی کی انگوٹھی ہے۔'' رانا کی بڑی بہن شازی نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔یہ میری ہے۔امی نے مجھے دے دی ہے۔ابو کے بالوں کی قسم۔''

''نہیں۔یہ امی کی نہیں ہے۔اب یہ میری بیٹی کی ہے۔کیوں رانا بیٹی۔''

''نہیں ابو اب یہ آپ کی ہے۔دیکھو ابو۔یہ امی کی ہے۔۔۔نہیں۔۔۔ابو کے بالوں کی قسم۔امی نے مجھے دے دی۔۔۔اب میں اپنے ابو کو دے رہی ہوں۔کس کی ہوئی۔ ہوئی نا میرے ابو کی۔''

''ہاں یہ تو سچ ہے۔اب یہ ابو کی ہوگئی۔اور میری بیٹی اس کے بدلے کیا مانگ رہی

ہے۔''

''وہی بک جو شازی دیدی کو لا کر دی ہے۔ یہ مجھے نہیں دے رہی ۔خود ہی ساری تصویریں دیکھتی ہے۔''

''اووو شازی بیٹا۔ یہ کیا، میری بیٹی کو نہیں دکھا رہی ہو۔تم تو بڑی ہو بیٹی۔ اپنی چھوٹی بہن کو بھی تصویریں دکھایا کرو۔''

''میں کیوں دوں گی۔ یہ پھاڑ دے گی تو پھر میں کس پر پڑھوں گی۔ مجھے اسکول میں مار پڑے گی۔''

''دیکھا ابو نہیں دیتی ہے۔''

''میں آپ کو نئی لا کر دوں گا۔بس میرا پتر۔''

''اے ے ے ے ے ۔۔۔ ابو کے بالوں کی قسم پھر تمہیں نہیں دوں گی ۔''

رانا غصے سے بڑی بہن شازی کی طرف انگلی اٹھاتی ہے تو شازی رونے لگتی ہے ۔محمد اقبال دونوں کو کھینچ کر سینے سے لگا دیتا ہے۔دونوں اس کے بالوں سے کھیلتی ہیں۔

اختری کا اصل نام راحیلہ اختر بی بی تھا لیکن جیسا کہ غریبوں کے ناموں کا دائرہ سکڑتے سکڑتے نقطے میں سمٹ جاتے ہیں۔ ویسے ہی اس کا نام بھی صرف اختری سمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی لیکن غریب والدین کی بیٹی ہونے کی وجہ سے ایک غریب کے ساتھ بیاہی گئی۔محمد اقبال نوجوان تھا صحت مند اور خوبصورت بھی۔اس کے بال ریشمی تھے جو ہوا کی ہلکی جنبش سے بھی لہراتے تھے۔مزدور ہو کر بھی وہ اپنا اور اپنی فیملی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ وہ سارے کام لگن سے کرتا تھا۔اس لئے کبھی بھی بے کار بیٹھا نہیں رہتا تھا۔گاؤں میں کوئی نہ کوئی اسے کام ضرور دیتا تھا۔اس کی دو بیٹیاں شازی اور رانا تھیں جن سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔وہ دونوں ابھی چھوٹی تھیں ۔صرف شازی ابھی ابھی اسکول جانے لگی تھی۔ پیار تو وہ

اپنی بیوی اختر بی بی کے ساتھ بھی بہت کرتا تھا۔ دراصل اسے فخر تھا کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی ہے اور سمجھ دار بھی۔ پھر بھی اُس نے اِس گنوار جیسے آدمی سے شادی کر لی۔ وہ اختر بی بی کی ہر ایک بات مانتا تھا۔لیکن آج اس کی ایک نہ سنی تھی۔ دراصل حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ کرونا وائیرس نے زندگی کی دوڑ جیسے منجمد کر دی تھی۔ ویسے بھی یہاں حالات خراب ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی۔آئے دن بند، ہڑتال، کرفیو کی وجہ سے غریبوں کی کمر ٹوٹ جاتی تھی۔ پھر بھی محمد اقبال کو اڑوس پڑوس میں کام مل جاتا تھا اور ان کا چولہا جلتا تھا۔لیکن جب سے اس کرونا وائرس کی وجہ سے کرفیو جیسا لگ گیا تھا تب سے وہ بالکل ہی بے کار ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ راستے سب بند کر دیئے گئے تھے۔اڑوس پڑوس میں بھی کوئی پوچھتا نہ تھا۔اسی اثنا میں سرکار کی طرف سے سفیدے درخت کاٹنے کی ہدایت جاری کر دی گئی۔ساتھ میں یہ حکم نامہ بھی کہ جو لوگ نہیں کاٹیں گے۔ان کے درختوں پر سرکار قبضہ کر لے گی۔کرفیو جیسے حالات میں درخت کاٹنے والے لکڑہارے ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ خود ہی کاٹ رہے تھے۔ جو نہیں کاٹ سکتے تھے، وہ پریشان تھے۔اب تو کام نکل آیا تھا۔مگر محمد اقبال کو پیڑ پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔اس کے پاس ڈھنگ کا سامان بھی نہیں تھا۔کئی پڑوسی اسے کام دے رہے تھے۔لیکن اختر بی بی اسے سختی سے منع کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حالات بہت خراب ہیں اور محمد اقبال کو پیڑ کاٹنے کا کام آتا بھی نہیں ہے۔۔۔کام مل رہا تھا اور اس کام کو کرنے کے لئے پیسے بھی اچھے مل رہے تھے۔گھر کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔محمد اقبال نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی کچھ پیسے کمائے۔ اختر بی بی نے اسے بہت روکا۔لیکن اس کی چھوٹی بیٹی تین دن سے ضد کر رہی تھی کہ وہ اسے تصویروں والی کتاب لا کے دے دے۔ وہ دن میں کئی بار روتے روتے محمد اقبال کے پاس آئی تھی۔اس نے رانا سے وعدہ کیا کہ جونہی وہ کام پر جائے گا وہ اس کی کتاب لے کر آئے گا۔

محمد اقبال کام پر گیا اور آج اسے پیسے بھی اچھے مل گئے تھے۔ وہ کچھ گھریلو سامان کے ساتھ ساتھ رانا کے لئے تصویروں والی کتاب بھی لانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جس گلی میں وہ گھر کا سامان لاتا ہے وہیں کتاب والے کا گھر بھی ہے جو گھر ہی میں کتابیں بیچتا تھا۔ کتاب اور کچھ سودا سلف لے کر وہ گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اچانک لوگ بھاگنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سپاہی ان لوگوں کو مارنے کے لئے پیچھے دوڑ رہے تھے جو بلا وجہ سڑکوں پر گھومتے تھے۔ کئی جگہوں پر لوگوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے سپاہی غصے میں آ گئے تھے۔ سپاہیوں سے بھری ایک تیز رفتار گاڑی نے اسے ٹکر ماردی اور وہ کئی فٹ ہوا میں اچھل کر گرا۔ سارا سامان سڑک پر بکھر گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں بس اتنا دیکھا کہ رانا کی تصویروں والی کتاب اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ اس نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن اسے پہلے ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پولیس نے اس کو اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا تھا۔ اب اختر بی بی بھی اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ شوہر کی دیکھ بال کے لئے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ ابھی محمد اقبال کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔ اسپتال والوں نے کئی بار اس کا خون لیا۔ اس کے بہت سارے ٹسٹ کئے گئے۔ اختری بی بی شام تک یہاں سے وہاں دوڑتی رہی۔ لیکن اسے کچھ بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ اس کے شوہر کی حالت کیسی ہے کیونکہ اسے I.C.U کے اندر جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ آخر اس نے ایک ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑا کر شوہر کی خیر وخبر پوچھ لی۔ وہ ایک شریف النفس نوجوان ڈاکٹر تھا۔

”دیکھئے ابھی میں زیادہ نہیں بتا پاؤں گا۔ مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔ ٹسٹ آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ اس کا اندر تو کوئی ڈمیج نہیں ہے۔ پیشنٹ بھی ابھی ہوش میں نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے یہ بھی بتانا مشکل ہے کہ کوئی ہڈی ٹوٹی تو نہیں ہے۔ بس اللہ سے دعا کیجئے اندر کوئی چوٹ نہ لگی ہو۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس کی بیک بون میں کوئی فریکچر تو نہیں“

''کیا مطلب ڈاکٹر صاحب، میں سمجھی نہیں۔''

''مطلب ہے کہ اگر یہ زندہ رہے گا بھی تو کچھ کر نہیں پائے گا۔ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کمر سے نیچے اس کا سارا جسم بے کار رہے گا۔'' ڈاکٹر بتا رہا تھا۔ لیکن اختری بی بی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔

''ایسے پیشنٹ کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔ مر جانا بہتر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

''نہیں نہیں ۔۔۔ مجھے میرا شوہر چاہئے ۔ جیسا بھی رہے مجھے میرا محمد اقبال چاہئے۔

اختری بی بی اپنے شوہر کو ایک بار دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی بیٹیاں بھی لگاتار ضد کر رہی تھیں کہ وہ اپنے ابو کو دیکھیں ۔آخر بڑی منت سماجت کے بعد ان کو I.C.U کے دروازے تک آنے دیا گیا۔ یہ شیشے سے اندر دیکھ رہی تھیں ۔ اندر تین بیڈز پر تین مریض پڑے تھے ۔لیکن ان میں محمد اقبال کون ہے یہ پہچاننا مشکل تھا۔ اس کی چھوٹی بیٹی رانا نے دروازے کو آہستہ سے دھکہ دیا۔ جو تھوڑا سا کھل گیا اور وہ تیزی کے ساتھ اندر گھس گئی۔ دروازے کا گیٹ کیپر چلاتا رہا۔ جلدی سے اندر گیا۔ لیکن تب تک رانا کمرے کے بیچوں بیچ پہنچ چکی تھی۔ اور وہ یہاں سے تینوں بیڈوں پر پڑے مریضوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اے لڑکی۔ یہاں کہاں گھس گئی۔ چلو باہر نکلو۔''

''چاچو۔۔۔ ایک بار ابو کو دکھا دو نا۔ ہم نہیں دیکھیں گے۔ ابو کے بالوں کی قسم ہم اپنی آنکھیں بند کر کے رکھیں گے۔ بس امی کو ایک بار دکھا دو۔'' چھوٹی بچی نے اپنے ننھے منے ہاتھ اپنی آنکھیں پر رکھ دیئے تو گیٹ کیپر کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آنکھیں کھولو بیٹا۔ اپنے ابو کو ٹھیک سے دیکھو۔'' لیکن شازی نے آنکھیں نہیں

کھولی

''بیٹا تم آنکھیں کھولو۔اپنے ابو کو اچھے سے دیکھو۔ پھر میں ایک ایک کر کے آپ کی امی اور بہن کو بھی اندر لاؤں گا۔کھولو آنکھیں بیٹا۔''

رانا آنکھیں کھولے ایک ایک مریض کے قریب جا رہی تھی۔مریضوں کے چہروں پر ماسک چڑے ہوئے تھے۔ان کے بازوؤں میں کئی طرح کے ڈرپ سیٹ لگے تھے۔اوپر سفید چادر پڑی تھی۔کسی کو پہچاننا مشکل تھا۔لیکن آخر اس نے اپنے ابو کو پہچان ہی لیا۔اور وہ زور سے چیخی۔

''امی ابو مل گیا۔ابو مل گیا۔'' وہ دوڑتے دوڑتے دروازے تک آ گئی۔

''آہستہ بیٹی ۔۔۔آہستہ۔یہاں چلانا نہیں۔'' گیٹ کیپر بھی سہا ہوا دروازے تک آ گیا۔اور باہر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

''امی میں نے ابو کی انگلی میں میری انگوٹھی پہچان لی ہے۔'' اس کی ماں اور بڑی بہن شازی اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

''کوئی نہیں ۔۔۔ بچی ہے۔'' گیٹ کیپر اب بھی دروازے کے باہر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔جب اسے یقین ہو گیا کہ بچی کے چلانے پر کوئی ڈاکٹر یا نرس یہاں نہیں آ گئے ۔تو اس نے اختر بی بی کو خاموشی کے ساتھ اندر جانے کے لئے کہا۔پھر باری باری تینوں ماں بیٹیوں نے اندر جا کر محمد اقبال کو دیکھا ۔جس کے چہرے پر ایک بڑا ماسک چڑھا تھا۔ ہاتھوں اور بازوؤں میں گلکوز بھرنے کے ڈرپ سیٹ لگے تھے۔وہ رگوں کے ذریعے دوائیاں تو لے رہا تھا۔لیکن اس کی سانسیں بہت دھیمے سے چل رہی تھیں۔

تینوں ماں بیٹیوں نے اسپتال کے ایک کونے میں آنکھوں آنکھوں میں رات کاٹ لی لیکن ان کی نظر I.C.U کے دروازے پر ہی لگی تھیں۔وہ بتا سکتی تھیں کہ رات میں مریضوں

کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر اور نرسیں کتنی بار اندر گئیں اور کتنی بار باہر آ گئیں۔ ابھی ایک سکنڈ کے لئے اختری بی بی نے آنکھیں بند کر لی تھیں کہ رانا نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''امی۔ امی۔۔۔ دیکھو دروازے پر کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔'' اختری بی بی جلدی سے اٹھ گئی۔ دوڑتے دوڑتے سر کا دوپٹہ ٹھیک کر دیا اور دروازے تک پہنچ گئی۔ وہاں کئی ڈاکٹر اور نرسیں تھیں جن میں کل شام کا نوجوان ڈاکٹر بھی کھڑا تھا۔ اور I.C.U کا گیٹ کیپر بھی۔ اختری بی بی نے سلام کیا تو گیٹ کیپر نے ڈاکٹر کو بتایا۔

''یہ اس پیشنٹ کی فیملی ہے۔''

''اچھا اچھا۔ ہاں دیکھئے۔ ہم نے آپ کے پیشنٹ کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بچ نہ سکا۔''

اس کے بعد اختری بی بی کو ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ آہستہ آہستہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھ گئی۔

رانوں نے چپ کے سے دروازہ کھولا اور سکنڈ کے ہزاویں حصے میں وہ محمد اقبال کے بیڈ کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''ابو مجھے وہ تصویروں والی کتاب نہیں چاہئے۔ ابو مجھے تمہارے بالوں کی قسم۔ میں کتاب نہیں مانگوں گا۔ اٹھ جاؤ ابو اٹھ جاؤ۔ ہم اپنے گھر جائیں گے۔ میں وہاں بھی کتاب نہیں مانگوں گی۔۔۔ ابو۔ ابو آپ کام پر بھی مت جاؤ۔ ہمیں پیسے نہیں چاہئے۔ اگر مجھے بھوک بھی لگے گی نا۔ تو میں تمہیں کام پر نہیں جانے دوں گی۔۔۔ اٹھ جاؤ ابو اٹھ جاؤ۔۔۔ ابو اٹھ جاؤ۔'' وہ باپ کو ہلا ہلا کر رو رہی تھی۔

''ارے یہ اندر کون شور کر رہا ہے۔ اس کو باہر نکالو۔ یہ اندر کیسے گئی۔''

''ارے ارے لڑکی باہر آ جاؤ۔ یہاں شور نہیں کرتے۔ چلو باہر۔'' گیٹ کیپر اندر

آ گیا اور رانا کو بازو سے کھینچنے لگا۔لیکن رانا نے مضبوطی سے باپ کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور اس کھینچا تانی میں محمد اقبال کی انگلی سے انگوٹھی نکل کر آ گئی جو رانا کے ہاتھ میں رہ گئی ۔اور گیٹ کیپر اسے باہر تک کھینچ لایا تھا۔

اچانک وینٹی لیٹر کے تار جھنجنا اٹھے اور کالے سکرین پر روشنی کی لکیریں دوڑنے لگیں۔اب گیٹ کیپر بھی چلا اٹھا تھا۔

''یہ زندہ ہے۔ڈاکٹر صاحب یہ زندہ ہے۔''

☆☆☆

لاک ڈاؤن

''سنو۔۔۔ہیلو۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔آپ ہی سے کہہ رہی ہوں۔آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہو''

یہ جھیل ڈل میں ہوس بوٹ کی چھت پر کھڑی زینب آرا چلا چلا کر وفد میں آئے ان لوگوں سے کہہ رہی تھی جو پاس والے لکشیر یس ہوس بوٹ کی چھت پر جھیل ڈل کا نظارے کر رہے تھے۔دراصل صبح صبح ہی جھیل ڈل کا سیکورٹی فورسز نے کارڈن کر دیا تھا اور ڈل میں موجود سبھی کشتیوں اور موٹر بوٹس پر سپاہی تعنات کر دیئے گئے تھے۔کہا جارہا تھا کہ کئی ملکوں سے وفود آرہے ہیں جو کشمیر کے حالات دیکھیں گے۔ویسے بھی یہاں جو بھی لوگ حالات دیکھنے آتے ہیں وہ کشمیریوں کے بجائے کشمیر کے ہی حالات دیکھتے ہیں۔مطلب وہ یہاں آکر کشمیر کے صحت افزا مقامات کی سیر وتفری کرتے ہیں۔قدرتی حسن کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اور سیر سپاٹا کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور قومی چینلز پر اپنا بیان جاری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کشمیر میں امن وامان ہے۔

یہاں پچھلے تین ماہ سے کرفیو جاری تھا اور پابندیاں اتنی زیادہ تھیں کہ بچوں کے لئے دودھ اور روٹی لینے کے لئے بھی پولیس کو ہاتھ جوڑنے پڑتے تھے۔

اس طرح کے وفود کے ٹھہرنے کے لئے کسی سرکاری جگہ یا کسی بڑے ہوٹل میں انتظام کیا جاتا ہے۔لیکن باہر سے آئے زیادہ تر لوگ جھیل ڈل میں رکنا اور کسی لکشیر یس ہوس بوٹ میں بیٹھنا ہی پسند کرتے ہیں۔آج کے وفد کے لئے بھی نہرو پارک کے قریب ایک بڑے اور خوبصورت لکشیر یس ہوس بوٹ میں انتظام کیا گیا تھا۔لکشیری ہوس بوٹ کے ارد

گرد ایسے کئی ہوس بوٹ بھی موجود ہیں جن میں وہ لوگ رہتے ہیں جن کا گزارہ سیاحوں کے آنے پر ہی منحصر ہے

زینب آرا کے گھر میں بھی کئی روز سے بھوک دستک دے رہی تھی۔ کھانے کے کنستر خالی ہو رہے تھے۔ بچے دودھ اور روٹی کے لئے ترس رہے تھے۔ پھر بھی وہ کسی طرح سے کشتی نکال کر کہیں سے بھی دودھ روٹی لے آتی تھی۔ لیکن آج رات کو ہی سارا جھیل ڈل کارڈن کیا گیا تھا۔ اور لوگوں کو باہر جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔ زینب آرا کا ہوس بوٹ لکشری ہوس بوٹ کے ساتھ ہی لگا تھا۔ اور ان کے ہوس بوٹ پر بھی دو سکورٹی اہلکار کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ زینب آرا نے ان سے التجا کی تھی کہ وہ بھی چھت پر تھوڑی دیر کے لئے دھوپ میں بیٹھ جائے۔ سکورٹی اہلکار نے ایک تو اسے عورت سمجھ کر اور دوسری وہ بزرگ خاتون بھی تھی اسے اوپر کرسی ڈال کر دھوپ میں بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اہلکار بندوق تانے لکشری ہوس بوٹ پر نظر رکھے ہوئے مستند کھڑے تھے۔ زینب آرا بھی اسی ہوس بوٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں وفد ٹھہرایا گیا تھا۔ وفد میں شامل لوگ ایک ایک کر کے چھت پر آ رہے تھے، شاید وہ جھیل کا نظارہ کرنے اور تھوڑی دھوپ سینکنے کے لئے چھت پر آ گئے تھے۔ ڈل جھیل کا نظارہ کرتے ان کی نگاہین زینب آرا سے ٹکرائین جو انہیں دیکھتے ہی ہاتھ ہلانے لگی اور ساتھ ہی زور زور سے آوازیں بھی دے رہی تھی۔

''سنو۔۔۔ہیلو۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ آپ ہی سے کہہ رہی ہوں۔ آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہو'' وفد میں آئے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن اس کے قریب کھڑے سکورٹی اہلکار چوکس ہو گئے۔ انہوں نے اس کی طرف بندوقیں تان دی۔ زینب آرا بھی سمجھ گئی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں دکھا دیا کہ میں تو خالی ہاتھ ہوں بس مہمانوں سے بات کرنا چاہتی ہوں۔

''آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہو۔''

''ہم یہاں آپ لوگوں کے لئے آئے ہیں۔آپ کی خیریت معلوم کرنے۔''

ان میں سے ایک باوقار شخص ایک قدم آگے آیا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں ہمارا مذاق اڑانے آتے ہیں آپ لوگ۔ برسوں سے ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔آج لگاتار تین مہینوں سے گھروں میں محصور ہیں۔بچوں کے لئے روٹی اور دودھ نہیں ہے۔گھر میں کھانے کے لئے چاول نہیں ہیں۔سپاہی گھروں سے باہر جانے نہیں دے رہے ہیں اور آپ ہماری خیریت معلوم کرنے آئے ہیں۔کیا مذاق ہے۔''اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی وفد کے قریب کھڑے آفیسر نے سکورٹی والوں کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھا تو وہ زینب آرا کو گھسیٹتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔لیکن جاتے جاتے وہ کچھ اور بھی کہہ گئی۔جو وفد میں شامل لوگوں نے بھی سن لیا۔

''تم لوگ ساری دنیا سے آئے ہونا۔اور ہماری بے بسی دیکھ کر ترس بھی نہیں کھاتے ہو، میرا خدا تمہاری دنیا کا یہی حال کردے جو ہمارا ہوا ہے۔تاکہ تمہیں بھی ہماری گھٹن اور ہمارے درد کا احساس ہو جائے۔''

اور اس کے چند ماہ بعد ہی ساری دنیا کشمیر کی طرح لاک ڈاؤن کی مقید ہو گئی ہے۔

☆☆☆

مانگے کا اجالا

''اے خدا۔۔۔ یہ کیا کر دیا۔۔۔ میرے مولا۔۔۔۔۔۔ ہائے میرے نصیب پھوٹے۔۔۔۔'' حلیمہ کی دل دوز چیخیں کھڑی بھیڑ کا سینہ چھلنی کر رہی تھیں اور اس کی دو جواں بیٹیاں عورتوں کے سنبھالے سے بھی نہیں سنبھل رہی تھیں، چیخ و پکار اور شور شرابے میں کسی کی بھی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جبار بٹ کی لاش اسپتال کی سفید چادر میں لپٹی اُس کے آنگن میں پہنچ چکی تھی۔۔ سارا قصبہ اُمڈ آیا تھا۔۔۔ جلسے جلوسوں اور ہڑتال کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔۔۔ قصبہ پانچ دن سے بند تھا، ہڑتال، نعرہ بازی، جلسے جلوس اور ہنگامہ آرائی میں کئی درجن لوگ زخمی ہو گئے ۔ گاڑیاں جلائی گئیں، گھروں کے شیشے، کھڑکیاں اور دروازے توڑے گئے۔ آٹھ دس نوجوان جیلوں میں بھی بند کر دیئے گئے۔۔۔ جبار بٹ پانچ دن پہلے شام کی نماز پاس والی مسجد میں ادا کرنے کے بعد غائب ہو گیا تھا، تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ راتوں رات بات پھیل گئی۔ جبار بٹ کو یا تو نامعلوم افراد نے اغوا کیا ہے ۔ یا وہ کسی تعذیب خانے میں بند پڑا ہوگا۔۔۔۔ جبار بٹ سفید پوش آدمی تھا، اُس کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی، کسی کے ساتھ کیا بیر۔ اُس کے گھر میں بڑی مشکل سے چولہا جلتا تھا۔ اس کی بیوی حلیمہ لوگوں کے گھروں میں چاول صاف کرتی تھی۔ دو جوان بیٹیاں مہندی کے لیئے ترس رہی تھیں۔ خود وہ گلی کی نکڑ پہ ٹھیلا لگاتا تھا۔ ہڑتال کے دنوں محلّہ محلّہ جا کر چیزیں بھیجتا تھا۔۔۔۔۔۔ غریب تو اس کا پڑوسی غلام میر بھی تھا جس کے تین مشٹنڈے بیٹے صرف آوارہ گردی کرتے تھے ۔ مگر بقولِ جبار بٹ اچانک اس کی قسمت جاگ گئی تھی۔۔۔۔ اس کا ایک بیٹا گولی کا شکار ہوا۔۔۔۔۔ سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے بیٹے کو

نوکری ملی تھی، تیسرے بیٹے نے ٹھیکہ داری شروع کی۔ان کے دن پھر گئے۔غلام میر نے ٹھیلے کو خیر باد کہا اور مسجد کا موذن ہو گیا۔۔۔۔ جبار بٹ بہت دکھی تھا۔غلام میر کی خوشحالی اسے دیکھی نہیں جاتی تھی۔کافی محنت اور جوڑ توڑ کے باوجود اس کی ہر صبح منحوس اور ہر شام اداس رہتی تھی۔گھر میں روز جھگڑے ہوتے تھے۔حلیمہ اکثر طعنہ دیتی رہتی تھی۔

''آخر تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو؟ کب تک ہم یہ کسم پرسی کی زندگی گذارتے رہیں گے۔''

''کیا کروں میں۔۔۔کرتو رہا ہوں۔۔۔۔صبح گدھے کی طرح بوجھ ڈھونا شروع کرتا ہوں، دن بھر گلی گلی چلاتا رہتا ہوں، پھر جب شام کو تھکا ہارا واپس لوٹتا ہوں تو یہاں تمھاری کھٹ پٹ سنتا رہتا ہوں۔''

''اور کرو گے بھی کیا۔۔۔سامنے والوں کو دیکھو۔۔۔۔۔۔ ہنہ،کہاں سے کہاں پہنچ گئے،اور تم ہو کہ۔۔۔۔بس''

جبار بٹ حلیمہ کے طعنوں سے اتنا عاجز نہیں تھا، جتنا وہ سامنے والے غلام میر سے خار کھاتا تھا،اس کی آذان دینا جبار بٹ سے قطعی برداشت نہیں ہوتی تھی۔اسی غم میں وہ اکثر خلاء کو گھورتا رہتا تھا،یا دور نیلے آسمان میں کچھ تلاشتا رہتا تھا۔کسی چیز پر ٹکٹکی باندھے اس کے منہ سے اکثر یہ آواز آہ بن کر نکل جاتی تھی'' کاش غلام میر کی طرح اس کے بھی تین بیٹے ہوتے اور ایک یا دو بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' اسے آگے وہ میٹھے میٹھے سپنے بننے شروع کر دیتا تھا۔

جب بادِ مخالف چلتی ہیں تو بادباں گرائے جاتے ہیں،نہیں تو ناؤ کا رُخ بدل بھی جاتا ہے اور انجانے بھنور میں پھنسنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔لیکن جب ذہن و دل میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے تو سامنے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔انسان کچھ ایسا کر جاتا ہے کہ وہ حرفِ غلط کی طرح صفحہ زیست سے مٹ جاتا ہے۔کبھی کبھار اس کی قسمت مہربان بھی ہو جاتی

ہے ۔لیکن قسمت کی مہربانیاں بہت کم اور کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غلام میر کا عیش وآرام اوراسکی زندگی کا بدلاؤ جبار بٹ کی راتوں کی نینداوردن کا چین اُڑانے کے لئے کافی تھا۔وہ اپنی طرح غلام میر کوبھی لکیر کا فقیر دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی ۔۔۔۔پھر اچانک اس کے بھوسے بھرے ٹھیلے والے ذہن میں ایک عجیب وغریب مگر خوفناک اُور وحشت ناک ترکیب نے چنگاری ڈال دی جس نے شعلے بھڑکا دیئے ۔۔۔۔۔

بہت سے فیصلے لینے آسان نہیں ہوا کرتے ہیں،لیکن جب جنون ذہن و دل کو ماؤف کردیتا ہے تو ایک ہی دھن سوار ہوجاتی ہے۔۔۔۔''یہ کرنا ہے۔۔۔۔بس یہ کرنا ہے ۔۔۔۔!''

تخیل کے چاند سے جب جبار بٹ نے زمین کی طرف دیکھا تو اُسے زمین پر سب سے حسین اورخوبصورت گھر جولگا، وہ اس کا اپنا گھر تھا۔۔۔اُس کی بیوی خوش تھی ۔ دونوں بیٹیوں کے ہاتھوں کی مہندی قوسِ قزاح کے رنگ بکھیر رہی تھیں اور ہر طرف پھیلی بھینی بھینی خوشبو ہوا کو معطر کررہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آج ہڑتال ختم ہوگئی۔۔۔۔۔ہسپتال والوں نے جبار بٹ کی موت کوقتل نہیں بلکہ خودکشی قرار دیا۔لوگوں کا غصہ افسوس میں بدل گیا۔ ہر چہرے پر ندامت کا پسینہ تھا۔سرکار خوش تھی۔اُن کا ایک لاکھ بچا تھا۔۔۔اورنوکری بھی۔۔۔۔۔۔۔۔

حلیمہ اب بوڑھی ہوچکی ہے۔وہ اب بھی ٹھیلے پر بیٹھتی ہے۔اسکی بیٹیاں ہر مہینے بالوں میں خضاب لگاتی ہیں،اور ہر ہفتے ہاتھوں میں مہندی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ☆☆☆

مذاق

''مجھے تو یہاں پر ایک بھی سیول آدمی نہیں چاہئے۔ سارے vip's اور سیول ایڈمنسٹریشن کے لوگ ہونے چاہئے'' ایمرجنسی میٹنگ میں سیکورٹی کے ذمہ دار آفیسر نے اپنے ماتحت آفیسران کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

تیاریاں زور وشور سے چل رہی تھیں ۔سارے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے متحرک کر دیئے گئے تھے۔ leave پر گئے سارے آفیسران کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئی تھیں۔سب کو اپنی اپنی Duty پر حاضر رہنے کی ہدایات دے دی گئی تھی۔ پوری ریاست میں ہائی الرٹ اور سیکورٹی کا سخت بندوبست کر دیا گیا تھا۔سبھی Upperground اور underground ایجنسیاں کام میں لائی جا چکی تھیں،۔ان کو کام میں سرعت لانے کے احکامات بھی صادر کئے گئے تھے ۔۔۔

شاہ پور بستی میں حاکمِ اعلیٰ آرہا تھا،اس لئے ساری سرکاری مشینری حرکت میں آ گئی تھی۔ ہر طرف بھاگم بھاگ شروع ہوگئی تھی۔ سیلاب سے متاثرہ لوگ خوش تھے۔خوش تو منسٹر صاحبان اور آفیسران بھی بہت ہو رہے تھی۔،لیکن ان کو یہ غم بھی ستا رہا تھا کہ حاکمِ اعلیٰ ان کے حسبِ منشاء ہی ریلیف کا اعلان کریں گے یا ان کے خلاف۔۔۔

شاہ پور کے سیلاب ذدہ علاقوں میں اب کوئی شور شرابہ نہیں ہو رہا تھا۔۔۔، نہ کوئی ہنگامہ کرنے والا تھا ، اور نہ ہی کوئی تماشہ بین ۔۔۔ امدادی کاروایاں کب کی بند ہوچکی تھیں۔۔۔اب کبھی ہفتوں کے بعد کسی غیر سرکاری تنظیم کے لوگ آ کر متاثرہ عوام میں دو چار جوڑے کپڑے ۔۔ ایک دو کمبل ۔۔،یا دو تین تھیلیاں خوراک بانٹ دیتے تھے ۔۔۔ اور

اپنا Photo session کر کے چلے جاتے تھے۔۔۔ پھر وہی اجڑتی بستیوں کی خاموشیاں، وہی بے رونق چہروں پر جمی اُداسیاں۔۔۔اور سوکھے ہونٹوں پر متواتر درد وقرب کی سسکاریاں۔۔۔

جب سیلاب سے بستیاں برباد ہوگئی تھیں۔اس کو بھی اب دو مہینے سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا۔بستیوں میں کھانے پینے کا سامان بھی کافی آچکا تھا۔لیکن لوگوں کو جو درپیش مسئلہ تھا، وہ ان کے رہنے کا مسئلہ تھا۔جو ابھی جوں کا توں تھا۔۔۔سردیاں شروع ہوچکی تھیں۔برف باری کے امکانات بڑھ رہے تھے۔اس موسم میں لوگوں کو گرم گھر اور مضبوط چھت کی سخت ضرورت تھی۔سرکاری دعوے سارے کھوکھلے ثابت ہورہے تھے۔۔۔ابھی بستیاں ویراں تھیں،ابھی لوگ خیرات کے ٹنٹوں، چھپروں اور گھروں کے ٹوٹے پھوٹے حصوں میں رہ رہے تھے۔۔۔اب نہ کوئی سرکاری کارندہ ہی بستیوں میں آتا تھا،اور نہ کوئی حاکم۔۔۔لوگ روزمرہ کام کاج سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے،وہ سرکاری دفتروں کا طواف کررہے تھے۔۔۔ان کی سوچ بھی منجمند ہورہی تھی۔وہ یاس اور ناامیدی کے سائیے میں جئے جارہے تھے۔۔۔اور ان کی آنکھیں دور سڑک کی جانب لگی رہتی تھیں، کہ اب یا جب کوئی تو ان کی مدد کو آئے گا۔۔۔

سیکورٹی کے سخت انتظامات میں حاکمِ اعلیٰ پہنچ رہے تھے۔شاہ پور کے خوبصورت اور صحت افزا مقام (لیکن ہائی سیکورٹی زون) چنار باغ میں پنڈال سجائے گئے تھے۔زرق برق وردی میں ملبوس نامور سکول کے بچوں کے ہاتھوں میں رنگ برنگی جھنڈیاں دے دی گئی تھیں، جو وہ بڑے طمطراق سے ہلا جھلا رہے تھے۔۔۔سٹیج کے دائیں بائیں خوبصورت گلدستے لئے منسٹر حضرات لائن میں کھڑے تھے۔۔۔اردگرد کا ماحول صاف و پاک اور سیلاب کے دھول دھپے سے کوسوں دور تھا۔آسمان میں گڑگڑاہٹ سی ہوگئی، تو سب کی نظریں اوپر کی طرف اٹھ گئی تھیں۔آسمان میں کئی ہلی کاپٹر چکر لگا رہے تھے۔ایک ہیلی پیڈ پر اتر

چکا تھا، اور دو داو پر سے گل باری کر رہے تھے۔ جب حاکمِ اعلیٰ سٹیج پر آ گیا تو تالیوں کی گونج میں وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے اردگرد طائرانہ نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ چنار کے پیڑوں پر موسمِ خزاں کی ہوا لگ چکی تھی۔ پتوں پر سنہرا پن آ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں چنار کے ملتے زرد پتوں کے بیچ سے جگمگ کرتی آ رہی تھیں، ڈوبتی کرنوں میں تمازت بہت ہلکی ہلکی سی آ رہی تھی۔ سارے ماحول میں سنہرا سنہرا سا رنگ جھلک رہا تھا۔ فضا خوش کن اور خوش رنگ لگ رہی تھی۔ ہر ایک چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ کئی چہروں پر جوش و خروش بھی دکھ رہا تھا، اور وہ سورج کی ہلکی تمازت میں دھمک رہے تھے۔۔۔ حاکمِ اعلیٰ کو سارا ماحول خوشگوار اور خوبصورت لگ رہا تھا۔

اگر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است و ہمیں است

یہ شعر حاکمِ اعلیٰ کو کبھی بھی یاد نہیں رہا تھا، لیکن اس وقت اپنے اردگرد کا ماحول دیکھ کر اسے یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا۔ مدہوش کر دینے والی شام چنار کی چھاؤں تلے بیٹھے لوگوں کو تھپکیاں دے رہی تھیں، اب ہوا میں تھوڑی سی کھنکی بھی آ گئی تھی، لیکن حاکمِ اعلیٰ کی تقریر اتنی پر جوش اور پر اثر تھی کہ سردی کا احساس ماند پڑ چکا تھا۔ تقریر میں یہاں کی خوبصورتی کی بڑی تعریفیں ہو رہی تھی، اس کی پاسبانی کے لئے سیکورٹی کو مزید سخت کرنے پر زور دیا جا رہا تھا، اور اس کے حسن و آبرو کے لوٹنے والے لٹیروں کو آنکھیں نکالنے کی دھمکی بھی دے دی جا رہی تھی۔۔۔۔ پھر چراغاں کرنے کی رسم کا وقت آ گیا (رنگ برنگے دیئے بیرونِ ریاست سے منگائے گئے تھے) چراغوں کی روشنی کے بیچ سٹیج پر کھڑے لوگوں کے چہرے دھمک رہے تھے۔ اور سب کے ہونٹوں پر فریبی مسکراہٹ رقصاں تھی۔۔۔ حاکمِ اعلیٰ کے جاتے ہی سٹیج پر افراتفری پھیل گئی تھی۔ اس کے دورے کی کامیابی پر سبھی لوگ مطمئن تھے۔ اور خوش بھی ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد بھی دے رہے تھے۔۔۔۔ اب سب کو اپنے اپنے

ٹھکانوں پر پہنچنے کی جلدی تھی ۔۔۔منسٹر صاحبان اور آفیسران حضرات vip گاڑیوں میں چلے گئے تھے۔۔۔۔۔

لیکن اس بھاگ دوڑ میں وہ ان سیلاب متاثرین کو بھول ہی چکے تھے، جن کو حاکمِ اعلیٰ سے ملانے کے لئے مفت گاڑیوں میں دور دراز علاقوں سے یہاں تک لایا گیا تھا۔جن کو ملانے کی بعد میں ضرورت ہی نہیں پڑی تھی ۔۔۔اب یہ شہرِ بے پرساں کے لوگ سڑکوں پر حیران و پریشان کھڑے تھے۔۔۔۔۔ پھر ان کے قدم آس پاس کی کسی ایسی مسجد یا گردوارے کی تلاش میں اٹھ گئے تھے، جہاں پر اب بھی سینکڑوں بے آسرا لوگ رہ رہے تھے ۔۔۔۔

☆☆☆

افسانچے
مائیکرو فکشن

ڈررر۔۔۔

رات اماوس کی ہوتی یا چاند رات کی ۔سرشام ہی ڈر ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔مغرب سے پہلے ہی لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے تھے۔مسجدوں سے بھی اعلان جاری ہوتا تھا کہ اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے پوری طرح سے مقفل کردو۔اگر کوئی دروازہ پیٹتا ہے تو دروازہ نہیں کھولنا۔البتہ اگر کسی دروازے پر دستک ہوتی ہے تو جس گھر میں ڈول ہے وہ لوگ ڈول پیٹیں گے۔جن کے گھروں میں ٹین کے ڈبے ہیں وہ ڈبے بجا دیں اور جن کے پاس بجانے والی کوئی چیز نہ ہو وہ برتن بجالیں یا چھت پر جا کر زور زور سے چلائیں ۔اب بستی میں ہر شام کسی نہ کسی گلی، محلے میں ڈول یا ٹین بجتا تھا تو مسجدوں کے لوڈ اسپیکر کھول دیئے جاتے تھے اور زور زور سے ہوشیار خبردار چلانے کا شور برپا ہوجاتا تھا۔ بستی کے لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر، گلے میں ڈول لٹکا کر اور زیادہ تر شور مچاتے گھروں سے باہر آجاتے تھے اور مسجد کے صحن میں جمع ہوجاتے تھے۔جہاں کوئی نوآموز مولوی ٹائپ لیڈر تقریر شروع کر دیتا تھا۔وہ لوگوں کو اور زیادہ ڈراتا تھا، دھمکاتا تھا کہ بستی کے لوگ گناہ گار ہیں۔اس لئے آسمان سے بلائیں اترتی ہیں اور ان کو یہ سزائیں بھگتنی پڑ رہی ہیں۔پھر بڑے خشوع خضوع کے ساتھ دعائیں مانگی جاتی۔لوگ اپنے ناکردہ گناہوں پر خوب روتے اور مسجد کے صحن سے ڈر کی ایک اور قبا اوڑھ کر گھر آجاتے ۔لیکن پھر بھی رات کے کسی پہر وہ خوفناک بلا کسی نہ کسی گھر میں کہیں سے بھی گھس جاتی تھی اور گھر کا کوئی چاہتا لاڈلا اٹھا کر لے

جاتی تھی۔ لوگ شور مچاتے تھے۔ یہ لیڈر حضرات لوگوں کو اکساتے تھے اور پوری بستی میں ہنگامہ شروع ہو جاتا تھا۔ پھر اور چار پانچ جانیں ہنگامے میں تلف ہو جاتی تھیں۔۔۔

اب اس بستی کا برسوں سے یہی حال ہے۔ دن ہو یا رات یہ خوفناک بلا بے خوف بستی میں آ جاتی ہے اور کسی ایک لاڈلے کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ لوگ بھی عادی ہو چکے ہیں۔ اب جب بھی ایسا کوئی سانحہ پیش آتا ہے۔ نہ کہیں ڈھول بجتے ہیں، نہ ہی مسجدوں سے نعروں کی آوازیں ہی گونجتی ہیں۔ البتہ لیڈروں کے اکسانے پر ہنگامے اب بھی ہوتے ہیں ۔ خون گرتا ہے۔ گلیاں سڑکیں عبادت گاہیں لال ہو جاتی ہیں۔ کئی اور لاڈلوں کے سر کٹتے ہیں۔ دو چار دن واویلا ہوتا ہے۔ پھر لوگ خود ہی صبر کر لیتے ہیں۔۔۔

لیکن ان نام نہاد لیڈروں سے اب بھی یہ کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ تم مقتول کے ہمدرد ہو یا اس خوفناک بلا کے ساتھی۔؟

☆☆☆

اب پچھتائے کیا ہوت۔۔۔

تنگ گلی سے نکل کر وہ قدرے ایک بڑی گلی میں آ گیا اور رک گیا۔ شاید فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ بڑی گلی کو دائیں طرف سے کراس کرے یا بائیں طرف سے آگے نکل جائے۔ وہ ایک سوکھی پتلی گائے کو کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ پاس ہی دکان کے تھڑے پر دو چار نوجوان موبائل پر کوئی گیم کھیل کر رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ایک لڑکے کی نظر گائے والے پر پڑی تو اس نے اشارے سے دوسرے لڑکوں کو آگاہ کیا۔ گائے والا کچھ شش پنج میں پڑ گیا۔ وہ لڑکوں کی طرف جانے کے بجائے دائیں طرف سے نکل گیا۔ لڑکوں نے کھیل بند کر دیا۔ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ لیا۔ ان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ آدمی کہیں سے یہ سوکھی پتلی بوڑھی گائے اٹھا کر لے آیا ہے جو یقیناً اب دودھ بھی نہیں دے رہی ہوگی اور وہ اسے کسی قصائی کے مذبحہ خانے میں لے جائے گا۔ معاملہ صاف تھا یعنی گاؤ ہتھیا۔ لڑکے خاموشی کے ساتھ آدمی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

گائے لے جانے والا جوان تھا اور صحت مند بھی، چہرے سے کوئی خطرناک قصائی لگ رہا تھا۔ وہ مختلف گلیوں سے گذرتا ہوا علاقے کی مین سڑک پر آ گیا۔ یہاں کافی رش تھا، گاڑیوں کا شور، سائیکل رکشوں کی دھکم پیل اور ساتھ میں لوگوں کی بھیڑ۔ یہاں کسی نے بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسے سبھی اپنی اپنی فکر و سوچ میں گم تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ علاقے سے نکل کر

وہ ایک کشادہ سڑک پر آ گیا۔آ گے ایک چوراہا تھا۔جب تک وہ چوراہے پر پہنچا تب تک وہاں اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔کسی کے ہاتھ میں ڈندا،کسی کے ہاتھ میں بالا تو کسی کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ابھی بھی گلیوں سے لوگ آ رہے تھے اور چوراہے پر جمع ہو رہے تھے۔ بھیڑ میں منچلے نوجوانواں کی تعداد زیادہ تھی۔کچھ غصے سے بپھرے ہوئے تھے،کچھ ہتھیاروں کی نمائش کرتے جا رہے تھے اور کچھ نعرے لگا رہے تھے۔

گلیوں سے چند اور لوگ بھی نعرے لگاتے چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔جواب میں زوردار نعرے بلند ہو رہے تھے۔ایک طرف پولیس والے بھی ڈندے لے کر کھڑے حیران و پریشان لوگوں کی جمع ہو رہی بھیڑ کو دیکھ رہے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا۔گاڑیاں،رکشے،پیدل چلنے والے لوگ سبھی رک گئے اور حیرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جو راستہ روکے کھڑے تھے۔چوراہے پر جم کر نعرہ بازی ہو رہی تھی۔اچانک ایک اور گلی سے کچھ نقاب پوش نکل آئے۔ان کے ہاتھوں میں بھی تیز دھار والے ہتھیار تھے۔

انہوں نے آتے ہی گائے والے پر دھاوا بول دیا اور پل بھر میں اسے لہولہان کر کے زمین پر گرا دیا۔وہ آخری سانسیں لے رہا تھا کہ بھیڑ میں سے ایک تریشول بردار کے دماغ میں ایک دلچسپ کھیل کھیلنے کا خیال آ گیا۔اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔اس نے اچانک مرتے بدن سے پاجامہ کھینچ لیا اور۔۔۔۔۔۔اور ساری بھیڑ ہکا بکا ہو کر رہ گئی۔لیکن تب تک مرنے والے کی گردن ایک طرف لڑھک چکی تھی۔

☆☆☆

آنکھ مچولی

میں گھر کی گلی سے مین روڑ پر آ گیا۔اب چوک تک صرف دوسوقدم ہی چلنا تھا کہ زور دار دھماکہ ہوگیا۔ سامنے سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔آسمان تک گردوغبار چھا گیا تھا۔دھماکہ چوک میں ہی ہوگیا تھا۔بیس لوگ مارے گئے تھے اور سو سے زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔۔۔

پارک میں کافی بھیڑ جمع تھی۔میں دوستوں کا انتظار کر رہا تھا کہ طارق ہاشمی کی کال آ گئی۔

''جلدی ریستورانٹ پہنچ جاؤ۔ہم اب پارک میں نہیں ریستورانٹ میں مل رہے ہیں۔جاوید سب کو چائے پلا رہا ہے۔'' میں جلدی جلدی پارک سے نکل آیا۔ ابھی ریستورانٹ میں گھسا ہی تھا کہ تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز سے ماحول گھونج اٹھا۔ہم سبھی ریستورانٹ کی کرسیوں اور ٹیبلوں کی آڑ لے کر چھپنے لگے۔پارک میں کئی خواتین اور بچوں کی لاشیں خون میں لت پت ہو رہی تھیں۔۔۔

سجاد نے گاڑی روکی اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی ہم سو دوسو گز ہی آگے چلے گئے کہ پیچھے بم پھٹا۔چاروں اور دھول ہی دھول اڑ رہی تھی۔۔۔

مانو پچھلے بیس برسوں سے زندگی اور موت آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

کبھی زندگی آگے، موت پیچھے ۔۔۔کبھی موت آگے اور زندگی پیچھے۔

حسبِ معمول آج میں پھر گھر کی گلی سے مین روڈ کی طرف جا رہا تھا۔۔۔اور۔۔۔ موت گلی کی نکڑ پر پوزیشن سنبھالے کھڑی تھی۔۔۔

☆☆☆

سرشت

جھیل ڈل کے مہنگے ہاؤس بوٹ میں ہنی مون منانے کا پروگرام بنا۔ دن بھر شکارے پر بیٹھے مغل باغات کی سیر ہوئی۔ یہاں کے رومان انگیز ماحول کا لطف اٹھایا۔ ہاؤس بوٹ کے بیڈ روم کو خوبصورت پھولوں سے سجایا گیا۔۔۔آدم نے حوا کا گھونگٹ اٹھایا۔ اس کا دھمکتا روپ دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگیا۔ جھیل ایسی گہری آنکھوں سے لیکر مخروطی انگلیوں تک تعریفیں کیں۔ اپنی تعریفیں سن کر حوا کا چہرہ تپنے لگا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ آدم نے جب اس کے اوپری ہونٹ اور ناک پر پسینے کے قطرے اُگتے دیکھے۔ تو ذہن و دل میں تلاطم برپا ہوگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ چادر اور تکیہ اٹھایا اور قریب پڑے صوفے پر لیٹ گیا۔ ایک چھنا کہ ہوا۔ اسے لگا وولٹیج بڑھ گئی اور گلوب کا بلب پھک سے اڑ گیا۔

یہ آدم کا روز کا معمول بنا۔ وہ صبح و شام حوا کی تعریف کرتا رہتا۔ حوا کی ایک ایک ادا کو سراہا تا۔ اس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھتا۔ جب حوا کے انگ انگ میں مستی پھیرنے لگتی۔ اس کا چہرہ جوش و جذبات میں لال لال ہونے لگتا۔ آدم چادر اور تکیہ اٹھا کر اسے الگ ہوجاتا۔۔ حوا غصے سے لال بھبوکا ہوجاتی اور گلوب کا ایک اور بلب پھک سے اڑ جاتا۔

بس کچھ دن پہلے ہی آدم اور حوا اب کی بار ''جنت'' کشمیر میں ملے تھے۔ حوا روٹھی اور آدم سے بے زار تھی۔

''یہ تیری ہوس تھی جس نے مجھے جنت سے نکلوایا۔ پھر صدیوں میرا استحصال ہوا۔

میں ہر دور میں تیرے ہاتھوں لٹتی رہی۔ پامال ہوتی رہی۔

تم نے ہمیشہ میرے جسم کو نوچا ہے۔ مجھے بس اپنی ہوس کی تکمیل کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔کاش میری روح کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا ہوتا۔

پھر آدم نے اسے وعدہ کیا کہ وہ اپنے ہوس کے بدمست ہاتھی کو نکیل بند کر دے گا۔۔۔ اب وہ صرف حوا کی آنکھوں میں ڈوب کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے کی سعی میں لگا تھا اور اس کی تعریف میں رطب اللساں تھا۔

آج پھر آدم کے قرب سے حوا جذبات کی تپش سے پگل رہی تھی۔آدم نے اس کی جلتی آنکھیں دیکھی تو چادر اور تکیہ اٹھانے لگا۔۔حوا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔جھٹک دیا۔۔۔ اور پھنکاری۔۔۔

''حد ہوگئی۔۔۔ نامرد کہیں کا۔۔۔''

☆☆☆

دو ہزار اکاون

جمع شدہ کھانے پینے کا سامان اور دوسری ضروری اشیا جب گھر میں ختم ہو گئیں تو میں مجبوراً گھر سے باہر نکلا۔ باہر کا منظر بہت ڈراؤنا تھا۔ افف کرونا سے بھی بڑا کوئی وائرس۔ اسی کی وجہ سے چار سو ہو کا عالم تھا۔ کوئی بھی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈرا سہما مین روڈ پر آ گیا تو یہاں اب کوئی اکا دکا انسان آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سبھی لوگ ایک دوسرے سے کترا کر چل رہے تھے۔ میں مطلوبہ اشیا کی تلاش میں کئی دکانوں سے گزر گیا۔ کئی گلیاں اور چوراہوں پر گھوما۔ لیکن کہیں پر بھی کوئی دکان کھلی نظر نہیں آئی۔ میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں دور سے ہی کسی آدمی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر میں کہیں کوئی دکان کھلی تو نہیں ہے جہاں سے میں راشن اور دوسری ضروری چیزیں لے سکتا تھا۔ لیکن سب مجھے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھ سے دور بھاگتے رہتے۔

اب مین بازار ہی میری امید کا سہارا تھا۔ میں نے جب سڑک پار کی تو مجھے مخالف سمت ایک عمر رسیدہ عورت اور ایک مرد نظر آئے۔ مرد کے کندھے پر ایک کمزور اور لاغر سی لڑکی جھول رہی تھی۔ مرد ایک ہاتھ سے بچی کو پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی لڑکھڑاتی بیوی کو سہارا دے رہا تھا۔ مرد کی حالت کچھ کچھ ٹھیک لگ رہی تھی جبکہ عورت کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ دونوں کے ننگے پیر جگہ جگہ زخمی تھے جن سے گاڑھا گاڑھا رس نکل رہا تھا۔ شاید ان کی شریانوں میں خون ختم ہو چکا تھا۔

میں جونہی ان کے قریب پہنچا تو ایک مریل سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''بابو جی۔۔۔ بابو جی پانی۔۔۔ بابو جی ایک روٹی۔ میری بیٹی کے لئے۔۔۔ تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

میں نے ان کی طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر مرد کی آنکھوں میں امید کی جوت جاگ اٹھی اور اس کی بیوی حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ گردن سے جھول رہی بچی زندہ تھی کہ مر چکی تھی وہ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی جیب سے پانچ ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس نے نوٹ مجھے واپس کرتے ہوئے نحیف سی آواز میں کہا۔

''بابو جی روپے نہیں۔۔۔ روٹی۔۔۔ پانی۔۔۔''

☆☆☆

ماں

میرے بیٹے میں یہ نہیں جتاؤں گی کہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بھی ماں اپنی اولاد پر احسان نہیں کرتی۔ وہ تو اولاد کی سلامتی کے لئے اپنی جان تک نچھاور کرتی ہے۔۔۔

جب تم پیدا ہوئے تو بہت ہی کمزور تھے۔ کئی روز تک اسپتال میں بھرتی رکھنا پڑا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ تمہارا بچنا محال ہے۔ میں راتوں کو جاگ جاگ کر اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر روتی رہتی تھی۔ اللہ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگتی تھی۔ تمہارے سرہانے بیٹھی میں نے آنکھوں آنکھوں میں کتنی راتیں کاٹ لیں۔

تمہاری صحت، پڑھائی، خوشیوں اور چاہتوں کے لئے ہم نے اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔ تمہاری پڑھائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی ساری جمع پونجی نچھاور کر دی۔ تمہاری خوشی کے لئے اپنی خوشیوں کا گلہ گھونٹ دیا۔ تمہاری شادی بڑی دھوم دھام سے کر دی۔۔۔ اسی دوران تمہارے بابا ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ زندگی ان سے نبھا نہ کر سکی۔ اور میں اپنے ہی گھر میں مالکن سے دائی بن کر رہ گئی۔ تمہاری اور تمہاری بیوی کی نوکرانی ہو گئی۔ تمہارے بچوں کی گورنس بن گئی۔ لیکن تجھے خوش دیکھ کر میرا کلیجہ ٹھنڈا رہتا تھا۔ میں اور جانفشانی سے تم لوگوں کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ مجھے تمہاری خوشی کے بغیر اور چاہئے بھی کیا تھا۔ لیکن اب جب سے میں کمزور ہو گئی۔ نحیف ہو گئی۔ تم نے مجھے داماد کے گھر میں ڈال دیا ہے۔ حالانکہ تمہارے باپ

کے انتقال کے بعد میں اکثر بیٹی کے گھر جاتی رہتی تھی لیکن ایک دو دن میں ہی تم مجھے واپس لے آتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ تمہیں اور تمہاری بیوی کو آفس بھی جانا ہوتا ہے۔ تمہارے گھر میں میری ضرورت ہے۔ اتنے دن سے صفائی ستھرائی کسی نے نہیں کی ہوگی۔ گھر میں کام کاج اور تمہارے بچوں کو سنبھالنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مجھے بھی خوشی ہوتی تھی کہ تم مجھے واپس بلا رہے ہو۔ اور یہ سوچتی تھی کہ جیسی بھی رہوں گی لیکن اپنے بیٹے کے قریب رہوں گی۔

''میرا بیٹا میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' میں اکثر داماد سے کہتی اور وہ مسکرا کر رہ جاتا۔ لیکن اب تمہارے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ اب ان کو یا تمہارے گھر کو میری زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ میں نحیف ہو گئی ہوں۔ تمہارے نئے گھر میں جھاڑو پونچھا بھی نہیں لگا سکتی۔

لیکن بیٹے مجھے یہاں نہیں رہنا ہے۔ مجھے کہیں بھی ڈال دو۔ لیکن یہاں سے لیجاؤ مجھے۔ بیٹے میں بہت سارے دن داماد کے گھر نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ میرا داماد مجھے اپنی ماں کی طرح رکھتا ہے۔ لیکن جانے کیوں میں اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی ہوں۔ میرے بیٹے میں جانتی ہوں تم لوگوں کو اب میری ضرورت نہیں ہے۔ اس عمر میں اب مجھے مرنا چاہئے تھا لیکن کیا کروں، میں مرتی بھی نہیں ہوں۔

ہاں بیٹے ایک بات بتانا چاہتی تھی۔ کل یہاں ایک پڑوسن آئی تھی۔ باتوں باتوں میں اسی سے معلوم ہو گیا کہ دینا میں ایسے کئی لوگ ہیں۔ جو مجھ جیسی کمزور اور بے بس ماؤں کو رکھنے کے لئے بڑے بڑے گھر بناتے ہیں۔ جانے اس نے ان گھروں کا کیا نام بتایا، مجھے یاد نہیں رہا۔ بیٹے مجھ پر ایک احسان کرو گے۔ مجھے ایسے ہی کسی گھر میں ڈال دو۔ اتنے دنوں سے داماد کے گھر میں رہ کے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔

ملتجی۔۔۔تمہاری ماں

☆☆☆

کلر بلائنڈ

یہ گاؤں قوسِ قزح کے رنگوں سے بنا تھا۔ نیلے، پیلے، لال، گلابی، سبز، عنابی، جیسے سارے رنگ یہاں کی ہر شے میں بھرے ہوئے تھے۔ چھن چھناتے جھرنے ہوں یا ندی کا کنارہ۔ سبزہ زار ہوں یا دلفریب مرغزار۔ یہاں ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلتے تھے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو چار سو پھیلتی تھی اور ذرہ ذرہ معطر ہو جاتا تھا۔ لال رنگ یہاں کے سیبوں اور چہروں میں مشترک تھا۔ ہاتھ رنگِ حنا سے رنگے رہتے تھے اور ہونٹ مسکان سے بھرے بھرے۔ یہاں کے موسم بھی اپنے مقررہ وقت پر بدلتے رہتے تھے اور بدلتے موسم، مرغوب، معتدل اور دل لبھانے والے رنگ ساتھ لے کر آتے تھے۔ خوشبو تو خوشبو ہے ٹھہرتی کہاں ہے، پہنچ گئی ببول زدہ شہروں میں اور بتا گئی اپنا پتہ کہ ان کے پڑوس میں اونچے پہاڑوں کے اس پار ایک گاؤں ہے جو سات رنگوں سے بنا ہوا ہے۔ ببول نے اپنی فطرت دکھائی وہاں کے کیکر ذہن لوگوں کے سیاہ دلوں میں گاؤں کے یہ رنگ و خوشبو کھٹکنے لگے۔ انہوں نے یہاں کے رنگ بے رنگ کرنے کے کئی جتن کیئے، کئی حربے آزمائے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ تب ان کو ایک بری بات سوجھی۔ یہاں کے ہی رنگوں سے کھیلنے کا کھیل کھیلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرخ رنگ غلبہ پاتا گیا۔ باقی سارے رنگ پھیکے پڑتے گئے۔ اب بس ایک ہی رنگ نمایاں تھا جو کہ سرخ تھا۔ گلیوں سے چوراہوں تک، سیب کے باغوں سے آبشاروں تک، یہاں تک کہ جگہ جگہ سرخ رنگ تیزی کے ساتھ پھیلتا گیا۔ جس کے سامنے قوس قزح بھی ماند

پڑ گئی۔ یہاں تک کہ سفید رنگ بھی عنقا ہوگیا۔کہیں اگر سفید رنگ نظر بھی آ جاتا تھا تو اس پر بھی سرخ رنگ کے ہزار ہا چھینٹے لگے ہوتے تھے۔لیکن ان کا دل پھر بھی نہیں بھرا۔کہیں سے ان کے کلر بلائنڈ ذہن کے کشکول میں کالے رنگ کا کالا سکہ گرا تو وہ خوش ہوگئے۔انہوں نے یہاں کے نمایاں ہورے لال رنگ میں ذرد رنگ بھرنے کی کوشش کی تا کہ سارے رنگوں پر زعفرانی رنگ بھاری لگے۔لیکن قوس قزح اپنے سارے رنگ سمیٹ کر لے گئی اور خود کو آفتاب کی روشنیوں میں گم کرگئی۔ پھر تپش میں آ کر انہوں نے یہاں کے سارے رنگ ہی چھین لئے اور چارسو اندھیرا پھیلا دیا۔

اب یہاں کسی چہرے پر نہ سیب جیسی لالی نظر آتی ہے اور نہ ہی کسی ہونٹ پر گلاب جیسی مسکان ہی کھل اٹھتی ہے۔ نہ خوبصورت ہتھیلیوں پر حنا کا رنگ چمکتا ہے اور نہ ہی قوس قزح ہی اپنے رنگ بکھیرنے آ جاتی ہے۔لیکن کلر بلائینڈ لوگ اب اپنے ہی پھیلائے اندھیروں سے خوف زدہ ہیں۔ یہاں کے کالے رنگ سے بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ انہیں اب خود بھی یہ پتا نہیں چل پاتا ہے کہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر کیا ہورہا ہے۔کہیں پھر سے قوس قزح اپنے رنگ بکھیرنے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہے۔ یا وہاں پھر سے کوئی دھیمی ہوا تو نہیں چل رہی ہے۔ جو ان کے لئے کرونا وائرس سے زیادہ مہلک ثابت ہوجائے۔۔۔

☆☆☆

توکل

میری ماں اکثر بازو میں درد کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے کسی اچھے Orthopedic کو دکھادوں ۔ پرفضول میں پیسہ برباد کرنے کی وجہ سے میں ہمیشہ فرصت نہ ہونے کا بہانہ بنا کرٹالتا رہتا تھا۔

''یہ بھی کوئی بیماری ہے۔'' میں اسے ورزش کرنے کی ہدایت دیتا رہتا تھا۔۔۔ وہ کوشش تو کرتی تھی پر اسے ورزش کرنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جس پر میں جھنجھلا جاتا تھا۔ بار بار اسے ٹوکتا رہتا تھا۔۔۔ پھر کچھ میرے خوف سے اور کچھ اپنے توکل سے وہ چپ رہنے لگی۔ کبھی درد کی شکایت نہیں کی ۔۔۔

اب وہ صرف میری وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہتی ہے اور بار بار مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ جب سے میرے بائیں کندھے میں درد اٹھنا شروع ہوگیا ہے۔۔۔ میں رات بھر سو نہیں پاتا ہوں۔۔۔

☆☆☆

کرونا

نربھایا کیس میں ملوث ملزموں کی پھانسی کے بعد اگرچہ کئی دنوں تک حالات پرامن رہے لیکن رفتہ رفتہ ڈر اور خوف کا ماحول ماند پڑنے لگا۔ نئے شکاری شکار کی طاق میں بیٹھے رہتے۔ اور ایسا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جوان کو مل جاتا تھا۔

تنسی کام والی بائی جوزی کی جوان بیٹی تھی۔ اس کی ماں نزدیکی کالونی کے ایک گھر میں کام کیا کرتی تھی۔ اس گھر میں عمر رسیدہ میاں بیوی رہتے تھے، جن کا بیٹا اور بہو صرف اتوار کو ہی ان سے ملنے آتے رہتے۔ جوزی کچھ دنوں سے بیمار تھی۔ اس لئے ماں کے بدلے بیٹی کام پر جارہی تھی۔

اتوار تھی اور سرکاری کی طرف سے احتیاطی تدبیر اپنانے کے احکامات کے پیش نظر پورا دیش کرونا وائرس کی وجہ سے بند پڑا تھا۔ اس دن نہ بزرگ لوگوں کا بیٹا آیا اور نہ بہو، بلکہ اسے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ آج اتوار کو بھی کام پر آجائے۔

شام کو گھر جاتے وقت اسے نہ کوئی گاڑی ملی نہ ہی کوئی آٹو رکشا۔ اس لئے پیدل ہی گھر کی طرف چلنے لگی۔ وہ خوفزدہ تھی اور تیز تیز قدم اٹھائے جارہی تھی۔ راستے میں اکا دکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اسے تو بس اپنے محلے کے رہنے والے کلو اور اس کے تین دوستوں کا ڈر لگا رہتا تھا، جو اسے دیکھتے ہی اناپ شناپ بولتے رہتے اور اسے اکیلا دیکھ کر اٹھا لیجانے کے طاق میں رہتے تھے۔ ایک دو بار وہ کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن ناکام رہے۔

لوگ گھروں میں بند ہوگئے تھے۔لیکن کلوآج بھی اپنے دوموالی دوستوں کے ساتھ نسی کی تاک میں بیٹھا تھا۔وہ جونہی گلی میں پہنچی ان تینوں نے اسے دبوچ لیااور قریب ہی ایک ویران گھر کے اندر لے گئے۔اپنے دو دوستوں کو رکنے کا اشارہ کر کے کلو نسی کو دوسرے کمرے میں لے کر گیا۔لیکن صرف دومنٹ سے کم وقفے میں کلو بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

اس کے دونوں ساتھی ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔وہ موبائل کی ٹارچ جلا کر کمرے کی طرف گئے تو خوف سے چیخ پڑے۔نسی دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر بری طرح سے کھانس رہی تھی۔

☆☆☆

بھلا (ہو) کورونا

''بیٹے دن میں دس بار اعلان ہو رہا کہ گھروں میں بیٹھو، باہر مت نکلو۔
محلّہ کمیٹی کے بھی دو چار لوگ آ گئے تھے کہ تم کو روک لوں۔''
بیٹے نے نئی نئی ڈاڑھائی سے وضوع کا پانی ہاتھ سے گراتے ہوئے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹوپی درست کر کے گھر سے نکل گیا۔
''میرا بیٹا آٹھ کی اور تین سو ساٹھ کی دو ہی نمازیں پڑھتا تھا۔
آج کل دن کے پانچوں وقت مسجد میں اذان دیتا ہے۔''

☆☆☆

خالی پیٹ

غریب مزدور پر ظلم ڈھا رہے ہو اور یہ بے چارہ خاموشی سے تمہارا ہر ستم سہ رہا ہے۔۔۔ برداشت کرر ہا ہے۔تم دکھ پہ دکھ دیئے جا رہے ہو۔ اور یہ تمہارے سامنے احتجاج بھی نہیں کرتا۔تم سمجھ رہے ہو کہ یہ منہ میں زبان ہی نہیں رکھتا۔۔۔اس کے بازو شل ہیں۔اس لئے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔۔۔اس کے ناتواں کندھوں پر بوجھ کے اوپر بوجھ ڈالتے جا رہے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اسے درد ہی نہیں ہوتا۔

ستم کی بھی حد ہوتی ہے، یہ غربت کے دلدل میں پھنسا ہےاورتم اس کواور دبا رہے ہو،اور ڈبور ہے ہو۔دس بائی بارہ فٹ کھولی میں ٹھونسے ہوئے یا سیلن زدہ کرائے کے کمرے میں قیدیوں کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور یہ آدمی کیسے زندہ ہے، وہ سب تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔۔۔ایک کونے میں پڑی اس کی کھارش زدہ ماں کسمسا رہی ہے۔۔۔ برآمدے میں کھانستا باپ ہانپ رہا ہے۔۔۔ٹاٹ سے لپٹے باتھ روم میں ٹوٹی ٹونٹی ہاتھ میں لئے اس کی بیوی ننگی نہائی گی کیا اور نچوڑے گی کیا کے مصداق ڈر ڈر کر جسم کا ایک حصہ چھپا کر دوسرا حصہ دھو رہی ہے۔۔۔ اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں، یاس اور ناامیدی سے دروازے پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔اور یہ گھر کا اکیلا کماؤ آدمی جو چہرے سے ہی کمزور اور لاغر دکھ رہا ہے، یہ دن بھر غریبی کے تانے سنتے سنتے، دھونس دباؤ اور گالیاں کھا کھا کے اپنے خون پسینے میں تر گھر لوٹ رہا ہے۔ جیب میں ماں کی کھارش کے لئے تیل کی چھوٹی

بوتل، باپ کے لئے سستا تمبا کو، بچوں کے لئے دو الگ الگ پیروں کے چپل، ایک تھیلی میں آٹا سبزی۔۔۔۔۔اور چڑھی آستین کے اندر چھپائے اپنی آسودگی کا ایک کنڈیوم۔۔۔ یہ ہے ایک غریب کی زندگی جس کے ذمہ دار تم ہو۔۔۔ صرف تم۔۔۔۔۔

اب چپ نہیں رہوں گا۔ آج اس کے سامنے جاتے ہی یہ سب کہہ دوں گا۔ وہ یہ فیصلہ کرکے ایک عزم کے ساتھ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔لیکن ایک لمحہ کے ہزارویں حصے میں اس کے سارے منتشر خیالات اُڑن چھو ہو گئے۔۔۔ وہ بڑی عاجزی کے ساتھ سجدے میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔

''میرے مولیٰ میرا کہا سنا معاف فرما۔ تم تو جانتے ہو خالی پیٹ انسان کیا کیا نہیں سوچتا۔ جو کچھ سوچتا ہے وہ برا ہی سوچتا ہے۔ پر تم تو دلوں کے بھید جاننے والے ہو۔ اور بڑے معاف فرمانے والے ہو۔ مجھے بھی معاف فرما۔''

☆☆☆

دعوت یا ماتم

کہتے ہیں کوا کائیں کائیں کرے تو مطلب صاف ہے۔اس کو کہیں کھانے کے لئے مردار مل گیا ہے۔اور یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو دعوت اڑانے کے لئے بلا رہا ہے۔

لیکن اب کچھ خاص علاقوں میں کوے کائیں کائیں کرنا بھول گئے ہیں اور یہ اب ایک دوسرے کو بلانے اور دعوتیں کھلانے کے لئے کائیں کائیں بھی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی چونچ سے جو آواز اب نکلتی ہے وہ

''آہ ہا۔۔۔آہ ہا۔۔۔آہ ہا۔۔۔'' ہوتی ہے۔

لگتا ہے جب سے کوؤں نے دنیا بھر کے کھیتوں کھلیانوں، سیب کے باغوں، شہراؤں، چوراہوں، گرتے آبشاروں اور جہلم جیسے دریاؤں میں خون سے لت پت جوان لاشیں تیرتے دیکھیں ہیں، یہ دعوت اور ماتم کا فرق بخوبی سمجھ گئے ہیں۔۔۔

اور کائیں کائیں کے بدلے اب آہیں بھرتے ہیں۔۔۔آہ ہا کی آوازیں نکالتے ہیں۔۔۔

☆☆☆

جنت

عادل کی گھریلو جنت اکثر جہنم کی لپیٹوں میں گرتی رہتی تھی۔ اسے اپنا سارا وجود انگاروں پر لوٹتا محسوس ہوتا اور دماغ لاوا اگلنے کی سوچتا رہتا۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ روز روز صائمہ اور ماں کے جھگڑے۔ گڑی گڑی کچ کچ۔ جیسے ماں اور صائمہ چکی کے دو پاٹ ہیں اور عادل ہر روز اس میں پیسا جا رہا ہے۔ ان کے دونوں بیٹے فرہان اور سلمان بھی ساس بہو کی اس بے جا چک چک سے بے زار تھے۔ ہر وقت اپنی ماں کو سمجھانے اور دادی کو چپ رہنے کی ان کی التجا ہمیشہ رائیگاں جاتی تھی۔ پھر یہ کمرے سے ہی نکل جاتے تھے۔ لیکن عادل کا بھاگنا محال تھا۔ اس کے سامنے گھریلو رن بھومی اگر چہ چھوٹی سی تھی لیکن جنگی یودھا تیز طرار اور خونخوار قسم کی تھیں۔ وہ جب بھی ماں کے حق میں بات کرتا تو صائمہ اسے لڑ پڑتی۔ پھر دونوں میاں بیوی ہفتوں بات نہیں کرتے۔ ان کے آپسی جھگڑے کا بس یہی فایدہ تھا۔ جتنے دن میاں بیوی کے بیچ تناؤ رہتا تھا گھر میں خاموشی چھائی رہتی تھی۔ اور عادل اس کا بھرپور فایدہ اٹھاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے بیچ ہفتوں کیا مہینوں بول چال بند رہے تا کہ گھر میں کچھ دن امن تو رہے گا۔ صائمہ غصے والی بھی بہت تھی۔ دادی کا ساتھ دینے پر وہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی کوستی رہتی تھی۔ لیکن عادل اپنے بیٹوں سے خوش تھا اور سکون محسوس کر رہا تھا۔۔۔ ایک دن عادل کو کسی دوست نے وٹس ایپ پر ایک منٹ کی فلم بھیجی تو وہ اسے دیکھ کر بڑا متاثر ہو گیا۔ اس نے بڑے شوق سے یہ فلم اپنے بڑے بیٹے فرہان کو سینٹ کر دی۔

آج پورے دس دن کے بعد میاں بیوی کے بیچ صلح ہوگئی تھی۔صبح اچھی گذری تھی۔ ساس بہو کے بیچ کوئی نوک جھونک بھی نہیں ہوئی اور عادل خوش تھا۔وہ دفتر چلا گیا اور شام کو گھر لوٹتے وقت ماں کے لئے انار اور بیوی کے لئے سنترے ساتھ لایا۔لیکن ابھی اس نے گھر کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے بیوی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ساتھ میں ماں بھی زور زور سے بول رہی تھی۔ وہ ہکا بکا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے وہ بھی جھگڑے کا حصہ بن گیا۔اب غصے میں اس نے بیوی پر ہاتھ اٹھایا تو فرہان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر روکا۔وہ حیرت زدہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔

''سلمان۔۔۔'' وہ زور سے چلایا

''ابو یہ میں نے اسی فلم سے سیکھا ہے جو کل آپ نے مجھے سینٹ کی تھی۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ ماں کے پیروں سے جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔۔۔کوئی میری ماں پر ہاتھ اٹھائے اور اسے نہ روکوں تو کیا مجھے اپنی جنت خراب کرنی ہے۔

☆☆☆

ہمزاد

سنا ہے فیس بک پر میرا ہمزاد پیدا ہو گیا ہے۔۔۔میری لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں اسے نہیں مل پا رہا ہوں۔ کہتے ہیں فیس بک کے پاس ایک دوسرے کو دکھانے اور نہ دکھانے کے بہت سارے سادھن موجود ہیں۔ یہ چاہے تو بار بار کسی دشمن کو بھی سامنے لا کر کھڑا کر دے۔اور ہم چاہ کر بھی اپنے کسی چہیتے کو نہیں دیکھ سکتے۔شاید میرا یہ ہمزاد بھی فیس بک کے اس چھپا چھپی کھیل کا بھرپور استعمال کر رہا ہے اور مجھ سے چھپا بیٹھا ہے۔۔۔میرے ایک دو دوستوں کا کہنا ہے۔کہ وہ میری چیزوں کا کھل کر استعمال کر رہا ہے۔ابھی میں نئی پروفائل پکچر لگاتا ہوں تو صرف 5 منٹ بعد وہی تصویر اس کی آئی ڈی پر ہوتی ہے۔ جو پوسٹ میں لگاتا ہوں وہی اس کی وال پر بھی نظر آتی ہے۔ یوں تو میرے دوستوں کو اس نے اپنی فرنڈلسٹ میں شامل نہیں رکھا ہوا ہے اور بڑی احتیاط اور عیاری سے کام لے رہا ہے۔لیکن پھر بھی بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔ابھی تک میری دو دوستوں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہو چکی ہے۔ مڈھ بھیڑ بھی ایسی کہ میری یہ دونوں دوست اس کی فین بن چکی ہیں۔

میں کچھ پریشان ہوں اور کچھ کچھ مجھے غصہ بھی آ رہا ہے۔ پریشان اس لئے کہ کوئی میرے نام سے گڑبڑ کر رہا ہے اور غصہ اس بات سے ہے کہ یہ میں نہیں ہوں۔۔۔اور ابھی پتہ نہیں میرے کتنے دوستوں کے ساتھ وہ ایسا کر رہا ہوگا جس کی مجھے کوئی خبر بھی نہیں ہو رہی۔ اپنے غصے کا اظہار میں نے اس کی فرنڈلسٹ میں شامل اپنی ایک دوست سے کیا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ جلد سے جلد اسے بلاک کر دو۔"

" کیوں کیوں؟؟؟؟ میں ایسا کیوں کروں۔

"ارے بابا وہ میں نہیں ہوں۔اور وہ جو کچھ کر رہا ہے اچھا نہیں کر رہا ہے"

"تو برا کیا کر رہا ہے۔۔۔"

"یہی جو وہ کر رہا ہے۔ میرے دوستوں کے ساتھ بدتمیزیاں۔ جیسے آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔"

"میرے ساتھ۔۔۔میرے ساتھ تو اس نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔۔۔۔"

"ارے واااہ۔۔۔ابھی جو آپ بتا رہی تھی۔۔۔"

"اچھاا ووہ۔۔۔وہ بدتمیزیاں تھوڑی ہیں۔۔۔"

"پھر کیا ہیں وہ۔ میرے نام کے ساتھ میرے دوستوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ پتا نہیں کس کو کیا کچھ لکھ رہا ہے۔"

"اچھا رہنے دو۔ایک مزے کی بات بتاتی ہوں۔"

"مزے کی بات۔۔۔ وہ کیا۔۔۔ہاں ہاں بتا دونا۔کیا ہے مزے کی بات۔"

"وہ آپ سے زیادہ رومانٹک ہے۔۔۔۔اور سوشل بھی۔"

"سوشل؟؟؟؟ سوشل بولے تو۔۔۔"

"بولڈ۔۔۔۔"

"بولڈ۔؟؟؟۔۔۔ "

"ہاں بولڈ۔آج کے زمانے میں وہی سوشل کہلاتا ہے جو بولڈ ہوتا ہے۔۔۔آپ کی طرح صرف ادیب نہیں ہے وہ۔۔۔"

اور میں دیدے نچاتا رہ گیا۔۔۔یہ سوشل ہونے کے معنٰی کب بدلے۔☆☆

کالیفیکیشن

بچپن میں وہ سکول کے ہر جھگڑے میں آگے لیکن پڑھائی میں پیچھے تھا۔ دسویں جماعت میں پاس ہونے کے لئے متواتر کئی سال کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی۔۔۔ جوانی میں امن و آشتی سے بے زار اور دھنگوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک دھنگے میں پڑوسی کا گھر جھلا دیا اور اس کی بیٹی کا اغوا کیا۔۔۔ پھر اسی لڑکی کے قتل کے جرم میں جیل گیا۔۔۔ جیل میں سمگلروں سے واسطہ پڑا، سیاست دانوں سے پہچان ہوئی، وکلا اور قانون دانوں سے دوستی گانٹھ لی۔۔۔ صرف 6 سال کے بعد ہی جیل سے چھوٹ کر آیا۔۔۔ اب اچھے قد کاٹھ کا ہو چکا تھا۔ چہرہ بارعب تھا۔ بات بات پر آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔۔۔ کاروبار دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔۔۔ آنے والے الیکشن میں اس کی جیت طے تھی۔ اب جو اس نے نشہ آور زہر بیچنا سیکھ لیا تھا۔۔۔

☆☆☆

سی گریڈ تاریخ

کسی عزت دار آدمی کی ماں ، بہن کو ڈاکو اٹھا کر لے جاتے ہیں یا کسی ایماندار پولیس آفیسر کی بیوی بچے خود حکمران ہی اغوا کرواتے ہیں۔ پھر بھری عدالت میں یہ ثابت کرایا جاتا ہے کہ یہ بندہ تو خوشی خوشی اپنی ساری جائیداد سے دستبردار ہو رہا ہے۔ یا اپنی مرضی سے اپنی موت کے کاغذات پر دستخط کر رہا ہے۔ اس طرح کی فلمیں تو آپ پہلے سے ہی بناتے ہیں نا۔ لیکن گولڈن جبلی منانے کے باوجود بھی یہ فلمیں سی گریڈ ہی کہلاتی ہیں ۔۔۔ اور آج جو آپ تاریخ رقم کرنے جا رہے ہیں یہ بھی آپ کی فلموں کی طرح سی گریڈ تاریخ کہلائی گی۔

☆☆☆

بیٹی نہیں چاہیئے

ایسا بھی نہیں ہے کہ تم نے جو کہا میں مان بھی جاؤں ۔ میرا بھی فیصلہ اٹل ہے ۔ کچھ بھی ہو جائے میں تیری یہ بات نہیں ماننے والی ۔ میں نے کل رات سے کچھ بھی نہیں کھایا اور بیماری کا بہانا بنا کر اپنا بستر بھی الگ کر دیا۔لیکن تم بات ختم نہیں کرتے ہو۔تم بضد ہو اور میں بھی اپنی بات پر اڑ چکی ہوں ۔ کاش آج میرا بابا ہوتا۔اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنا دکھ بتا دیتی۔ ماں زندہ ہوتی تو اس کی چھاتی سے لگ کر اتنا روتی کہ جسم کا سارا خون آنسوں بن کر آنکھوں سے بہا دیتی ۔ بھائیوں کے گھر چلی جاتی ۔لیکن کس ایک کے پاس ۔انہوں نے تو میری شادی اپنے سر سے بوجھ اتارنے کے لئے کرادی ہے ۔ میری دو بیٹیاں ہوگئیں تب بھی کسی نے نہیں پوچھا۔۔۔ہاں میں ایک فیصلہ تو کر ہی سکتی ہوں، گھر سے بھاگ جاؤں ۔۔۔ لیکن کہاں ۔ کہاں رہوں گی ۔ کہاں جاؤں گی میں ۔۔۔۔؟؟؟

میں ضرور بھاگ جاتی ۔ کاش ۔۔۔ کاش برابری کا تمہارا نعرہ سچا ہوتا یا قدرت نے مجھے تیرا محتاج نہ بنایا ہوتا۔۔۔

اب چل میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں ۔ کس ہسپتال میں میری کوکھ میں پل رہی بیٹی کا قتل کرنا ہے۔۔۔

☆☆☆

بوند بوند کو ترسیں گے

چشمے کا پانی گرتا تھا تو پن چکی چلتی تھی۔ چکی کے نیچے سے ندی بہتی تھی۔ ندی کے کناروں پر پنگھٹ بنے تھے۔ پنگھٹوں پر سکھیاں مٹکے بھر بھر لاتی تھیں۔ سکھیاں بہار میں بہار یہ گیت گاتی تھیں۔ بہار کے بعد گرمی۔ گرمی کے بعد خزاں۔ خزاں کے بعد برف اور برف کے بعد پھر بہار۔ بہار سے بہار تک گیتوں کا موسم۔۔۔

یہ سیدھے سادھے لوگوں کا گاؤں تھا۔ گاؤں میں چشمہ ابلتا تھا۔ جس میں وہ کائی جمنے نہیں دیتے تھے۔ صفائی ستھرائی اتنی زیادہ تھی کہ پانی میں تھوکنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں کا چشمہ، ندی نالے، کھیت کھلیاں اور پگڈنڈیاں صاف وشفاف تھیں۔

موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔ موسم بدلے۔ گاؤں بدلے۔ گاؤں میں نل بجلی سڑکیں آ گئیں۔ گھروں میں خوشحالی آئی۔ ساتھ میں سستی کاہلی لائی۔ عمارتیں بنتی گئی۔ ندی نالے سکڑتے گئے۔ چشمے میں کائی جمی۔ پن چکی رکی پڑی۔ پنگھٹ اجڑے۔ مٹکے پھوٹے۔ سکھیاں چھوٹی۔ گیت روٹھے۔

بیس سال بعد پانی کی بوند بوند کو ترسیں گے لوگ۔ ایک خبر

اے او نالائقو ابھی بھی وقت ہے۔ چشمے کو پاٹ لو۔ اس میں جمی کائی کو ہٹا دو۔۔۔

☆☆☆

ہمزاد2

یہ سائینس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ڈس ایبل لوگوں اور حادثات میں ہاتھ پیر سے محروم لوگوں کے لئے سب سے زیادہ خوشی کا مقام بھی۔انسان کے کولون سے اس کا ہمزاد بنایا گیا تھا۔اب چاہئے انسان کا کوئی بھی اعضاء کٹ جاتا یا بیماری سے جسم کا کوئی حصہ خراب ہوجاتا۔اس کے کولون سے بنائے ہمزاد سے وہ حصہ کاٹ دیا جاتا اور اصل انسان کو لگادیا جاتا تھا۔اس سائنسی کارنامے کے بعد انسان کچھ زیادہ ہی لاپرواہ ہو چکا تھا۔اب اسے کوئی غم نہیں تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کٹ جائے یا خراب ہوجائے۔اب تو اسے اپنی ناک کٹنے کا بھی کوئی خوف نہیں رہا تھا۔

لیکن اب دنیا میں کئی ڈس ایبل ہمزاد گوم رہے تھے۔انہیں ختم بھی نہیں کیا جارہا تھا۔کیا پتا کب اس اشرف المخلوقات کا کونسا عضو خراب ہوجائے یا کسی حادثے میں کٹ جائے تو اس وقت اس کا ہمزاد ہی اس کے کام آجائے۔عموماً کہا جاتا تھا کہ ہمزاد کی جان اصل انسان کی جان سے جڑی ہے۔یہ ختم ہوجائے تو ہمزاد بھی ختم۔۔۔شاید اسی وجہ سے انسان کو اپنے ہمزاد سے کوئی ڈر یا خوف نہیں لگتا تھا۔لیکن اس بات سے بے خبر بھی تھا کہ کولون سے اس کے سارے خصائل اس کے ہمزاد میں منتقل ہو چکے تھے۔۔۔ایک دن ایک ہمزاد کو ایک دوسرے ہمزاد سے کچھ ان بن ہوگئی تو اس نے ہمزاد کے اصل انسان کا خون کردیا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ اصل انسان کے مرنے سے ہمزاد نہیں مرا تو وہ بہت خوش ہوگیا۔

اس نے اپنے اصل انسان کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر حقارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی ۔۔۔اگلے روز پرتاب پارک میں سبھی ہمزادوں کی جنرل کونسل کا اجلاس منعقد کرایا گیا۔جس میں ڈس ایبل ہمزادوں کے لئے تشویش کا اظہار کیا گیا۔۔۔

☆☆☆

انسانیت

سوشل سائیٹس پر ایک بچے کی تصویر دھڑا دھڑ شیئر ہو رہی تھی۔ جس کے ساتھ پولیس کی جانب سے اطلاع عام کی نوٹس بھی لگی تھی۔

''پولیس کو 4 سال کا بچہ ملا ہے۔ جو اپنے والدین کا نام اور گھر کا پتہ نہیں بتا پا رہا ہے۔ اگر کوئی اس بچے کو پہچانتا ہے تو ان فون نمبرات پر اطلاع کریں یا پولیس اسٹیشن آ کر رابطہ قائم کریں۔''

صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس کے سامنے بچے کے چار دعوے دار پہنچ چکے تھے۔

لیکن ان میں سے بچے نے کسی ایک کو بھی نہیں پہچانا۔

☆☆☆

طنزیہ تحریر

قربانی

"ایک بکرے سے کیا ہوگا۔" بیوی بڑبڑائی

" گنجائش اتنی ہی تھی" شوہر نے سمجھاتے ہوئے کہا

"پچھلے سال جو اڑوس پڑوس اور رشتہ داروں کے گھروں سے قربانی کا گوشت آیا وہ بھی اپنے بکرے کے گوشت کے ساتھ ملا کر رشتہ داروں کو بھیجا۔ پھر بھی کم پڑا"

"اور وہ جو فریج میں گوشت کئی دنوں تک پڑا رہا۔۔۔اس کا کیا"

"اہا۔۔ہاہا۔۔۔آپ کے چاہتے تھے وہ بھی آپ کے رشتہ داروں میں بانٹتی پھروں"

"تم میرے رشتہ داروں کو قربانی کا گوشت بھیجتی ہی کب ہو"

" بکرا ایک لاتے ہو اور وہ بھی تیری ہی رشتہ داری میں بانٹ دوں"

"جب دو دو بکرے لائے تب بھی ان کو کیا ملا۔ رانیں اور سینہ الگ کر کے رکھوائے جو اپنے بھائیوں کے گھر بھجوائے۔ باقی جو بچا اس میں ادھا فریج میں رکھوادیا۔ کچھ حصہ اڑوس پڑوس میں اپنی جان پہچان والوں اور سہیلیوں کو دے کر آئی۔"

"اور کس کو دے دیتی۔ یہ اڑوس پڑوس والیاں سب دیکھتی رہتی ہیں۔ اگلی عید تک بتاتی پھرتی ہیں کہ کس کے گھر کتنے بکرے کٹے۔"

"ہمارے بارے میں کیا بتاتی ہیں وہ۔"

"یہ ایسے ہی نہیں بھیجتی میں اپنے اڑوس پڑوس میں گوشت کے بڑے بڑے پیس بنا

کے۔ ان کو بتانا پڑتا ہے محلّہ بڑا ہے اور رشتہ داریاں زیادہ ہیں اس لئے کبھی تین تو کبھی چار بکرے زبح کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ جو سب سے زیادہ چک چک کرتی رہتی ہیں۔ انہی دس بارہ گھروں میں ہی دے کے آتی ہوں۔ وہ پورے محلے کی خبر رکھتی ہیں۔۔۔"

"تو اگلے سال پورا سانڈ قربان کرتے ہیں"

"ارےرےےے۔۔۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ محلے میں ناک کٹواوے گے کیا۔ سارے رشتہ داروں میں رسوا کرو گے۔۔۔ اب بڑے کا گوشت کھاتا کون ہے۔ میں تو الگ کر کے رکھتی ہوں اگر کوئی بڑے کا گوشت بھیجتا بھی ہے۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ اگلے سال سے قربانی کریں ہی نا"

"اچھا جی۔۔۔۔ تو پڑسیوں۔ رشتہ داروا اور یاری دوستی میں کیا کہو گے۔"

"ارے ہمیں خدا کو خوش کرنا ہے یا اڑوس پڑوس کو"

"وہ مجھے نہیں معلوم۔۔۔ میری خوشی کے لئے کچھ نہیں کرو گے تم"

"میں تم پر قربان جاوں۔ تم بول تم کس چیز سے خوش ہو جاوگی"

"جب ہمارے رشتہ دار، ہمارے پڑوسی اور ہمارے یار دوست ہمارا نام بڑھا چڑھا کر لیں گے۔۔۔ ہمارے ایک بکرے کو تین بکروں کی قربانی بتا کر

"اڑوس پڑوس میں ڈھنڈورہ پیٹیں گے۔۔۔ تو میں بہوووووت خوش ہو جاوں گی۔۔۔۔"

☆☆☆

آزادی

رتیلے سراب زدہ ریگستانوں سے دور ٹھنڈے چشموں اور شفاف آبشاروں کی سر زمیں ۔۔۔ سنگلاخ اور پتھریلی زمینوں سے پرے سرسبز اور شاداب خطہ۔۔۔ چہروں کو شق کر دینے والی دھوپوں سے بہت اوپر پہاڑوں کی گود میں لہلہاتا اور دل کو معطر کر دینی والی ہواؤں کا مسکن۔۔۔ یہ سبزہ زاروں، لالہ زاروں، مرغزاروں کا دیس۔۔۔ یہ ارضِ کائنات پر مثلِ فردوس بریں۔۔۔ جہاں سے وہ شیتل من کا اور اجلے تن کا کبوتر اپنی اور اپنے ڈیڑھ کروڑ ساتھیوں کی اسیری کی روداد لے کر پڑوسیوں سے رہائی مانگنے اور پڑوسیوں کی طرح رہنے کی گذارش لے کر گیا تھا۔لیکن پڑوسیوں کا یہی فیصلہ تھا کہ آزادی مانگنے والے اس کبوتر کو گدھوں اور چیلوں کو کھلا دیا جائے۔

آخر ایک دن گدھ دیس نے امن کے اس پیام بر کبوتر کو پکڑ لیا اور پھانسی پر چڑھایا۔اس کی میت خاموشی سے قید خانے میں دفن کر دی۔اور یہ سمجھ کر خوش ہو گئے کہ ایک پیامبر کی میت کو سلاخوں کے اندر دفنا کر پوری آزادی کو قید کر لیا۔لیکن یہ لوگ بھول گئے تھے کہ آزادی خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔اور خوشبو سلاخوں میں قید نہیں رہتی۔

☆☆☆

یادیں

"شازی بیٹا۔۔۔بیٹی شازی۔۔۔ارے بیٹی میرا جوتا کہاں ہے "

جیسے کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔آج پورے تین مہینے کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے مسجدیں کھل رہی تھی اور میں باجماعت نماز ادا کرنے کے فراق میں بڑی بےچینی محسوس کر رہا تھا۔میں جلد سے جلد مسجد پہنچنا چاہتا تھا تا کہ اگلی والی صف میں جگہ مل جائے۔

"ارے کہا گئے تم لوگ۔ شازی بیٹا۔میرا جوتا"

"ابو دیکھو نا۔رکھا ہے شو ریک میں۔میں نے پالش کر کے رکھا ہے"

"ارے بیٹا یہ تو نیا جوتا ہے۔جو میں آفس لے جاتا ہوں۔میں وہ پرانا جوتا ڈھونڈ رہا ہوں۔جو کٹا پھٹا ہے۔جس میں ٹوٹا ہو دھاگہ لگا ہوا ہے "

" کون سا۔۔۔اچھا وہ۔۔۔مسجد والا۔اماں۔۔۔ ابو شاید مسجد جا رہے ہیں۔وہ مسجد والا جوتا کہاں رکھا ہے"

☆☆☆

مکالمہ

ہیلو

ہیلو

کیسے ہیں آپ

الحمدللہ

آپ نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا

بات؟؟؟ یہ مذاق تو تم پچھلے ایک سال سے میرے ساتھ کرتی چلی آ رہی ہو۔ اور میں نے کئی بار تمہیں جواب بھی دے دیا ہے۔

وہ تو آپ اپنا جواب دیتے ہیں نا

ہاں۔۔۔اور کس کا جواب دے دوں؟؟؟

میرا جواب

تیرا جواب۔؟ میں سمجھا نہیں۔؟؟؟

میرا جواب۔مطلب میرا جواب۔وہ جواب جو میں چاہتی ہوں۔

کمال کرتی ہو تم بھی۔ تیرا جواب، میرا جواب کیسے ہو سکتا ہے؟

یہی تو میں پچھلے ایک سال سے آپ کو سمجھا رہی ہوں۔اپنی ہاں کو میری ہاں کے ساتھ ملائے نا۔

ہاہاہاہاہاہا۔۔۔پھر میرا اپنا کیا رہے گا۔

میرا سارا تو آپ ہی کا ہے۔آپ کو فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہاں اتنے بڑے شہر میں میرا اپنا گھر ہے۔ بزنس ہے۔ پیسہ ہے۔ وہ سب آپ ہی کا تو ہے۔

تم جانتی ہو میں 40 پلس ہوں

کتنی بار کہا۔ مرد اور گھوڑے بوڑھے نہیں ہوتے۔

میں نے بھی کتنی بار کہا ہے تم کو وووو۔۔۔ میں شادی شدہ ہوں ۔۔۔؟ میرے بچے جواں ہیں۔۔۔؟؟؟ اور میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔۔۔؟؟؟

کیوں نہیں کر سکتے۔۔آپ تو مسلمان ہیں اور آپ کی چار شادیاں جائز ہیں۔۔۔

اور جب مذہب کی بات آجاتی ہے۔۔۔ تو ووو۔۔۔

تو۔۔۔ میں لاجواب ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔

☆☆☆

دل بدلو

''رحمان بھائی! آج کے الیکشن میں کون سی پارٹی جیتے گی۔''

''صاحب جی! ہم کو کسی کی ہار جیت سے کیا لینا دینا۔ ہم مزدور ہیں تو مزدور ہی رہیں گے نا۔''

''رحمان بھائی، وہ تو بالکل الگ بات ہے۔ دیکھو اب غریب اور مزدور لوگوں کے بچے بھی پڑھے لکھے ہیں۔ اب تم اپنی ہی بات لے لو نا، تیری بیٹی BA Bed ہے، بیٹا MA ہے، پر ان کو نوکری کہاں ملی ہے۔ اور کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بھی سرکاری ملازم ہو جائیں، وہ بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں''

''ارے صاحب! ایسا کون ماں باپ نہیں چاہتا ہے۔۔۔ میں تو پچھلے 15 روز سے اسی کوشش میں لگا ہوں، اور مجھے پوری امید ہے کہ اب کے اس الیکشن کے بعد میرے بچوں کو نوکری ضرور مل جائے گی۔''

''اچھاااا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کیسے؟؟؟'' میں غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس نے بھی رازدارانہ لہجے میں کہہ دیا۔

''میں روزانہ صبح ہی صبح ''قومی پالٹی'' کے بڑے لیڈر کی بیٹھک پر جاتا ہوں، ان سے واعدہ لیا ہے کہ وہ میرے بچوں کو سرکاری نوکری دے دے گا۔ شام کو اپنے 'علاقائی پالٹی' والے کے گھر جاتا ہوں، اس کو تو بس میرے ہی بچوں کی فکر لگی ہے، وہ جیتا تو میرے

بچوں کی نوکری پکی۔ پھر رہی وہ 'آفتاب والی پالٹی' وہ 'تارہ والی پالٹی' اور اپنے علاقے کے آزاد امیدوار۔۔۔میں نے تو ان سبھی لوگوں سے واعدہ لیا ہوا ہے۔کوئی نہ کوئی تو جیتے گا ہی ۔۔۔ جو جیتے گا اسی کو پکڑ لوں گا۔۔۔''

''اور ووٹ۔؟ ووٹ کس کو ڈالو گے؟؟؟؟''

'' صاحب جی ۔۔۔ میں ٹھہرا مزدور آدمی۔ اب کون ووٹ ڈالنے کے لئے اپنا ایک دن برباد کردے گا۔ویسے بھی اس دن بائیکاٹ کی کال ہے ۔۔۔۔وہ بھی تو ایک پالٹی ہے نا۔۔۔!!!

☆☆☆

اولڈ ایج ہوم

میں ادیب ہوں۔ دانشور ہوں۔ اس لئے اپنے گھر والوں کی نظروں میں خبطی ہوں ۔شاید میں خبطی ہوں، ہر ایک بات جو اگر سیدھی بھی ہو۔ میرے ذہن میں سوالات ابھار لاتی ہے۔ سوال بھی ایسے ایسے کہ بال کے کھال اتروانے پر اکساتے ہیں۔

میں نے بچوں کو پالا پوسا۔ بڑا کیا۔ ان کو تعلیم سے آرستہ کیا۔ اپنے دن رات ایک کر دیئے ۔لیکن میں جانتا ہوں جب یہ بڑے ہو جائیں گے اور میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو میرے یہ بچے میری ایک نہ سنیں گے۔ میں جو بات کروں گا۔ یہ اس کا الٹا کر دیں گے۔ میں نے اپنا سارا جیون ان پر نچھاور کر دیا ہے اور یہ مجھے اس کا بدلہ دکھ اور تکلیف سے دیں گے۔ یہ میں جانتا ہوں ۔۔۔ پر میں بھی کسی پر بھروسہ کرنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی جینی ہے۔ چاہئے یہ سب لوگ میرے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔

بچوں کی شادیاں کر لی تو مجھے ان میں بغاوت کے وہ سارے عنصر نظر آنے لگے جن سے میری آگے کی زندگی پریشان کن ہو سکتی ہے۔ اب یہ میری ہر بات سے اختلاف کرنے لگے تھے ۔ پر میں کہاں ہار ماننے والا تھا۔ ان کی بیوں کے سامنے ہی ان کی کھری کھری سنا ڈالتا۔ یہ کیا سمجھتے ہیں آہستہ آہستہ سارے گھر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ مجھے ہر چیز سے بے دخل کرتے جائیں گے۔ اور ایک دن آئے گا یہ سارے گھر پر قابض ہوں گے اور مجھے کسی اولڈ ایج ہوم میں پھینک آئیں گے۔ میری بیوی بھی میری بات نہیں

سمجھتی تھی ۔ وہ ہمیشہ بچوں کی ہی سنتی آئی تھی اور آج بھی وہی کرتی تھی ۔لیکن میں بھی کہاں ماننے والا تھا۔اپنی بات پرڈٹا رہا تو میرے بچوں کو ہی گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔۔۔ میں خوش تھا۔ میں کسی کے سامنے ہارا نہیں تھا۔

اب میں واقعی بوڑھا ہورہا ہوں ۔ میری بیوی مجھے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی ۔اب مجھے ڈرستانے لگا ہے۔ کہ کسی صبح میں جاگوں گا ہی نہیں اور کئی دن کے بعد جب محلے والوں کے گھروں تک تعفن پہنچ جائے گا تو میری سڑی ہوئی لاش نکالی جائے گا۔اسے پہلے میرا یہ ڈراؤنا خواب سچ ہوجائے میں آج کی صبح بڑے عظم کے ساتھ اٹھااور گھر کے دروازے کےاو پر بڑا سا بورڈ لگایا جس پر جعلی حروف سے لکھ دیا ''اولڈ ایج ہوم''۔۔۔۔

☆☆☆

بُو

وہ بڑا تیز طرار چینل اینکر تھا۔جس کا بھی انٹرویو لیتا تھا اس کی حالت خراب کر دیتا تھا۔کیا منسٹر کیا افسر۔کیا سیاست دان کیا سوشل ورکر۔اسی کی زبان میں وہ سب کی کھٹیا کھڑی کر دیتا تھا ۔۔۔اب اکثر بڑے بڑے بیروکریٹ بھی اس کے پروگرام میں آنے سے گھبراتے تھے ۔۔۔

آج اس کے خاص شو ''روبرو'' میں ملک کا سیدھا سادا۔صاف گو لیکن حاضر جواب شاعر راجہ یوسف تھا۔۔۔کئی سوالات کا سیدھا سادھا جواب پانے کے بعد اینکر اپنے لب ولہجہ پر اتر آیا۔

اینکر :۔ ''چلئے ہم بھی مانتے ہیں کہ آپ اچھے شاعر ہیں۔لیکن یہ بتائے ایک دن میں آپ کتنی غزلیں یا نظمیں لکھ دیتے ہیں۔۔۔''

راجہ یوسف :۔ ''ایک دن میں کتنی غزلیں ۔۔۔؟؟؟ ارے صاحب یہ تو کبھی اتفاق سے ایک نشست میں پوری غزل ہوجاتی ہے۔ ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ کئی کئی دن تک ایک لائن بھی نہیں لکھ پاتے ۔غزل کی تو بات ہی نہیں۔کبھی کوئی غزل یا نظم ایک سال میں پوری ہوجاتی ہے۔اور کبھی صرف ایک شعر ہوجاتا ہے لیکن اس پر سالوں کوئی غزل نہیں بن پاتی۔۔۔'' مسکراتے ہوئے

اینکر :۔ ''ارے ایسا بھی کیا راجہ صاحب! آپ تو زیادہ ہی اپنا بھاؤ بڑھا رہے ہیں۔۔۔میں

بھی تو شاعر ہوں ۔کہانی کار ہوں ۔تجزیہ نگار ہوں ۔نقاد ہوں اور ساتھ ساتھ اتنا اچھا اینکر بھی ہوں ۔میں لکھنے بیٹھتا ہوں ۔تو ایک ساتھ کئی غزلیں لکھ ڈالتا ہوں ۔۔۔''

راجہ یوسف :۔ ''ہاااں ۔۔۔ہوسکتا ہے کسی کے ساتھ ایسا ہوتا بھی ہو۔ پر جہاں تک میرا ماننا ہے سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ۔۔۔ ویسے یہ تو بتائیے۔ یہ کہاں بیٹھ کر لکھتے ہیں آپ ۔۔۔؟''

اینکر :۔ بڑے جوش وخروش کے ساتھ ۔''سوچالئے میں ۔۔۔میں صبح سوچالئے میں بیٹھے بیٹھے دوچار نظمیں غزلیں سوچتا ہوں ۔''

راجہ یوسف :۔ ''اچھاااااا ۔۔۔ہووووووں ۔۔۔تبھی تو ۔۔۔آپ کے کلام میں بُو اتنی تیز ہوتی ہے۔''

☆☆☆

NAQSH FARYADI
(Short Stories)
by
RAJA YOUSUF



منفی اور متناقض صورت حال میں منفیت کی تغلیب اور مثبت افکار و اقدار کی ترسیل آسان عمل نہیں ہے۔ تصادم کو تفاہم اور تضاد کو تطابق میں بدلنے کا ہنر ہر کسی کو نہیں آتا مگر کشمیر سے تعلق رکھنے والے باشعور افسانہ نگار راجہ یوسف نے اپنے افسانوں میں اسی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ارضیت کا عنصر حاوی ہے۔ انھوں نے اپنی زمین اور وہاں کی زندگی کے واقعات، واردات، سانحات کی فنکارانہ عکاسی کی ہے۔ لمحہ لمحہ بدلتی سچویشن، غیر یقینی صورت حال، وسوسوں، واہموں سے بھری زندگی، تشویش اور تردد کے منفی اثرات کے باوجود ان کے افسانوں میں ایک پازیٹو امیجری ملتی ہے۔ چنّل چنار چوزے، بکری، بند کھڑکی کا کرب، گورکن، ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں کہیں کہیں علامتی اور استعاراتی انداز اختیار کرتے ہوئے اس زمین کا درد اور نوحہ پیش کیا گیا ہے، جہاں تعزیر، تقدیر بن چکی ہے۔ جہاں ہر پیشانی پر شکست آرزو کی عبارت تحریر ہے اور جہاں کا مسکن خوابوں، خواہشوں اور تمناؤں کا مدفن بن چکا ہے۔ ایسے منفی ماحول میں مثبت انسانی قدروں سے گہری وابستگی اور کشمیریت سے لگاؤ یقیناً دل گردے کا کام ہے۔

راجہ یوسف کے افسانوں میں پولیٹکل ریلزم بھی ہے اور سماجی واقعیت پسندی بھی اور ایک تخلیقی ذہن کا اضطراب والتہاب بھی۔ انھوں نے اپنی زمین کی چیخ اور کراہ کو کہانی کی شکل عطا کی ہے اور ان کا کمال ہے کہ اس کراہ میں وہ Negativity نہیں ہے جو انسان سے مثبت سوچ سلب کر لیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ژولیدگی اور ابہام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا رشتہ قاری کے ذہن سے فوری طور پر قائم ہو جاتا ہے اور وہ ان کہانیوں میں اپنی ذات اور زندگی کے زاویوں کو تلاش کرنے لگتا ہے۔ راجہ یوسف کے افسانوں میں اذیت اور عذاب کے ساتھ خواب روشن ہیں اور شاید یہی وہ خواب ہیں جو ہر ذی شعور فنکار اپنی آنکھوں میں زندہ رکھنا چاہتا ہے کہ خواب بھی مر گئے تو.....؟

حقانی القاسمی، نئی دہلی
11 مارچ 2021

GNK PUBLICATIONS
ISBN 978-81-951465-1-2
978-81-951465-1-2

Email : gnkpublications@gmail.com
Mob : 8082186649, 7006738304
Ph : 01951-295207
GNK URDU
GNK URDU
gnkpublications
GnkPublications